



# ایمان با تقدیر

پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری

## اخلاقیات و فقہ القانت

مرکزی سیکرٹریٹ ۳۶۵- ایم ماڈل ٹاؤن

لاہور - پاکستان



۹۲-۲۲-۸۶۷۱۲۲





# ایمان بالقدر



پروفیسر اکرم محمد طاہر القادری



انشاد فہمکنا القرآن

مرکزی سیکرٹریٹ ۳۶۵، ماڈل ٹاؤن ۰ لاہور (پاکستان)

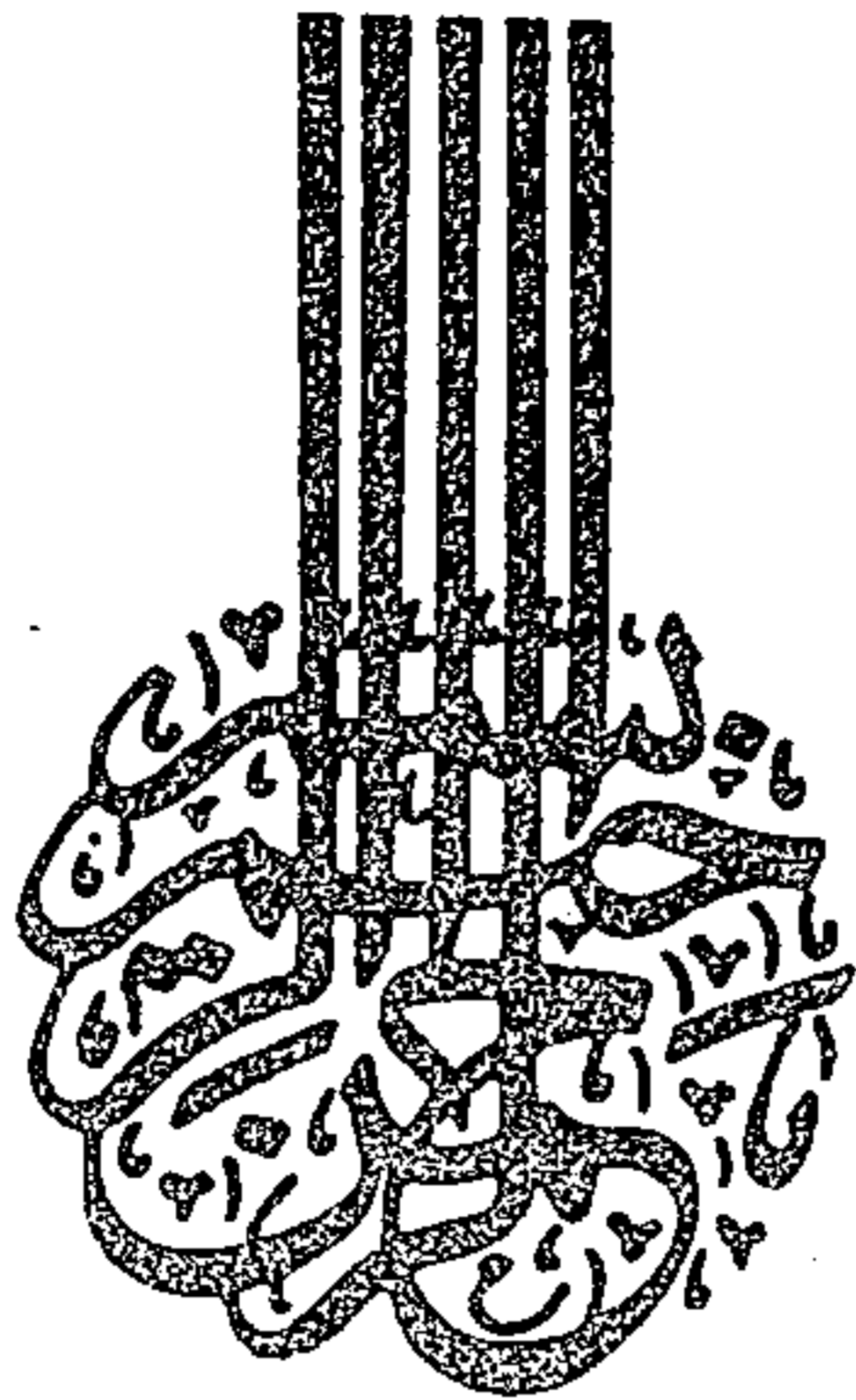
فون ۸۶۷۱۲۲-۴۲-۹۲

جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں

ہم کتاب	ایمان بالقدر
خطبات	پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری
ترتیب و تدوین	صیانتیر۔ جاوید القادری
اشاعت اول	جنوری ۱۹۸۹ء
تعداد	۲ ہزار
قیمت	۱۲/- روپے
مطبع	طبع فی المطبعة العریبية ۲۰۔ یکسور، بنسالی نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۱

نوٹ :- پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری صاحب کی تمام تصانیف اور خطبات و تقاریر کے ریکارڈ شدہ کاسیٹوں سے حاصل ہونے والی جملہ آمدنی ان کی طرف سے ہمیشہ کیلئے ادارہ منہاج القرآن کیلئے وقف ہے۔

ناظم نشر و اشاعت



مَوْلَانِي صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا أَبَدًا  
عَلَى خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمْ  
مُحَمَّدٍ سَيِّدِ الْكَوْنَيْنِ وَالْقَلْبَيْنِ  
وَالْفَرِيقَيْنِ مِنْ عَرَبٍ وَمِنْ عَجَمٍ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ وَعَلَى آلِهِ وَسَلَّمَ

گورنمنٹ آف پنجاب کے نوٹیفکیشن نمبر ایس او (پی۔اے) ۱-۲-۸۰/۱-۲ پی آئی وی مورخہ ۲۱ جولائی ۸۲  
 گورنمنٹ آف بلوچستان کی چٹھی نمبر ۸۰-۲-۲۰ ای جنرل و ایم ۲/۲-۹۶-۴۳ مورخہ ۲۶ دسمبر ۱۹۸۷ء  
 اور شمال مغربی سرحدی صوبہ کی حکومت کی چٹھی نمبر ۲۲۲۱۱-۶۶-این-۱/۱-۷۱ ڈی (لائبریری) مورخہ ۳۰ اگست ۸۶  
 کے تحت پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی تصنیف کردہ کتب ان صوبوں میں تمام کاجوں اور سکولوں کی لائبریریوں کے لئے  
 منظور شدہ ہیں

# فہرست مضامین

صفحہ	عنوانات	نمبر شمار
	— اہبان بالقدر	
۱۰	خلق عمل اور کسب عمل میں فرق	
۱۲	کیا مخلوق کے لیے دیکھا جانا ضروری ہے	
۱۵	جزا و سزا کا تعلق کسب سے ہے نہ کہ خلق سے	
۱۸	ایک غلط فہمی اور اس کا جواب	
۲۰	انسان کے مختار یا مجبور ہونے کا مسئلہ	
۲۰	حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد	
۲۱	بین العتدرو الجبر کا مفہوم	
	عمل انسانی کے تکمیلی مراحل	
۲۱	فرض اور خواہش میں کشمکش کا مرحلہ	
۲۲	غور و خوض کا مرحلہ	
۲۲	انتخاب نیت کا مرحلہ	
۲۳	عزم و ارادے کا مرحلہ	
۲۳	تعمیل کا مرحلہ	
۲۴	نتیجہ عمل کا مرحلہ	

۲۹	— قدر و جبر اور تصورِ عدل
۳۲	اللہ تعالیٰ کا تصورِ عدل
۳۲	عدل کا معنی رفیع — احسان
۳۶	خداوند تعالیٰ کی احسان پسندی
۳۷	خدا تعالیٰ اگر بندے کو مجبور کرنا چاہے تو اسے کوئی روک نہیں سکتا
۳۷	جزا اور سزا اور نظامِ عدل
۳۸	جزا و سزا اور امتِ حجت
۴۱	امامِ حجت کا مفہوم
۴۲	اخلاقی جدوجہد
۴۵	حالاتِ اضطراب اور قانونِ اسلامی
۴۷	سیدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کا ارشاد
۴۷	سلطنتِ اسلامیہ کا فرض
۴۸	سیدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ایک مقدر
۴۹	ایک صحابی کا سوال اور حضور علیہ السلام کا جواب
۵۱	— قضا و قدر کا انسانی زندگی میں کردار
۵۳	قدر کا مفہوم
۵۵	عوامی غلط فہمی اور اس کا ازالہ



صفحہ	عنوانات	نمبر شمار
۵۶	قضا اور تدر کی دو اصطلاحیں اور ان کا مفہوم	
۵۶	قضا و تدر آفاقی و کائناتی اعتبار سے	
۵۷	انسانی زندگی میں تدر کا مفہوم	
۵۹	قضا کا مفہوم	
۶۰	سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد	
۶۱	حق کی پکار جاری رہتی ہے	
۶۲	بیمار شخص کے لیے مرغن خوراک	
۶۳	قدر مقدم، قضا مؤخر	
۶۴	موسمی حالات کی پیشین گوئی	
۶۵	پیشین گوئیوں کا پس منظر	
۶۹	قضا معلق و قضا میرم	
۷۰	حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد	
۷۱	سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد	





ایمانیات کے سلسلے کا ایک اہم ترین موضوع ”ایمان بالقدر“ ہے۔ جو اجزائے ایمان میں سے آخری، مگر انتہائی مہتم بالشان جزو ہے۔ لیکن عجیب اتفاق ہے کہ اسی مسئلہ کی نسبت لوگوں کے ذہنوں میں طرح طرح کے شکوک و شبہات اور اوہام و وساوس پائے جاتے ہیں، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس موضوع پر کربید کربید کر گفتگو سے منع فرمایا ہے۔ آپ کا ارشاد ہے کہ شیطان تم میں سے

لف ”القدر“ قدریت و تدبیراً سے مصدر ہے، جس کے لفظی معنی اندازہ لگانے پیدا کرنے، لکھنے یا توانا ہونے کے ہیں، لیکن اصطلاح شریعت میں اس سے مراد خداوند تعالیٰ کا وہ ذاتی ارادہ ہے، جو مختلف حقائق کائنات کے تعلق میں اپنے مقررہ اوقات پر ظاہر ہوتا ہے۔ (دستور العلماء، ۳: ۳، مطبوعہ حیدرآباد دکن)

خداوند تعالیٰ کے ہاں ہر چیز کے بے پناہ خزانے ہیں، مگر ان خزانوں کو ایک خاص انداز

سے نازل کیا جاتا ہے، ارشاد باری ہے:

ہر چیز کے ہمارے پاس بے شمار خزانے

وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا عِنْدَنَا

ہیں، مگر ہم انہیں ایک مقررہ انداز سے

خَزَائِنَهُ وَمَا نُنزِّلُهُ إِلَّا بِقَدَرٍ

ہی نازل کرتے ہیں۔

مَعْلُوم (الحجر، ۲۱: ۱۵)

اسی لئے کا نام مسئلہ تدبیر یا مسئلہ قضا و قدر ہے۔

کسی ایک کے پاس آتا ہے اور پوچھتا ہے کہ تجھے کس نے پیدا کیا، فلاں چیز کو کس نے پیدا کیا، یہاں تک کہ وہ پوچھتا ہے کہ خدا کو کس نے پیدا کیا، آپ نے فرمایا کہ بس یہاں رک جاؤ، شیطان کے شر سے خدا کی پناہ مانگو۔ اس سے آگے نہ سوچو۔ اس مقصد یہ تھا کہ لوگ اس پچیدہ اور نازک مسئلے میں خواہ مخواہ الجھ کر اپنی عاقبت نہ خراب کر بیٹھیں۔ کیونکہ یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ انسانی عقل و دانش اس نازک مسئلے کے حقیقی مضمرات کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ لہذا اس موضوع پر بحث و تمحیص میں حد سے آگے بڑھنے کا نتیجہ گمراہی ہی ہو سکتا ہے۔

اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ "انسان کے مجبور یا مختار" ہونے کا مسئلہ صرف مذہبی فلسفے کا ہی موضوع بحث نہیں رہا، بلکہ یہ دنیا بھر کے فلاسفہ، مفکرین اور علماء کا محبوب ترین موضوع رہا ہے۔ نفسیات، جرمیات، عمرانیات اور دیگر مختلف فلسفوں میں اس مسئلے پر سیر حاصل مباحث ملتے ہیں۔ جنہیں مسلم اور غیر مسلم مفکرین اور فلسفیوں نے اپنے اپنے فکر اور اپنے اپنے علم سے فروع بخشا ہے۔ پھر یہ ہر زبان کے ادب اور شاعری کا بھی موضوع رہا ہے، اس بنا پر اس مسئلے میں قسم قسم کی آراء ملتی ہیں، اسی لیے اس کے اثرات خواص سے لے کر عوام تک کے ذہنوں کو متاثر کرنے میں اہم کردار انجام دیتے ہیں۔

### الف، خلقِ عمل اور کسبِ عمل میں فرق

اس سلسلے میں قرآن کریم تقدیر کے جس کلیتے پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ انسان اور اس کے جملہ اعمال کو اللہ تعالیٰ نے



تخلیق کیا ہے، چنانچہ ارشادِ باری ہے:

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ ۝  
 حالانکہ تم کو اور تمہارے اعمال کو  
 خدا نے ہی پیدا کیا ہے۔

اس آیت میں انسان اور اس کے اعمال دونوں کی تخلیق کو خداوند تعالیٰ کی طرف منسوب کیا گیا ہے، مگر یاد رہے کہ تخلیق اور کسب دو مختلف المعانی اور مختلف المقاصد الفاظ ہیں، کسب (اسی سے اکتساب بروزن افعال ہے) کے معنی کرنے یا کمانے کے ہیں۔ جبکہ خلق اور تخلیق کے معنی کوئی چیز پیدا کرنے اور وجود میں لانے کے ہیں۔ انسان اپنے افعال کا مکتسب (یعنی کمانے اور کرنے والا) ہے، مگر ان کا خالق اللہ تبارک و تعالیٰ ہے۔ انسان اور اس کی تمام تر اشیاء و اعمال مخلوق محض ہیں، جبکہ خداوند تعالیٰ دنیا کی ہر چیز کے خالق و باری ہیں۔ اس طرح اس کائنات میں فقط دو تصورات رہ جاتے ہیں، اول خداوند تعالیٰ کے خالق ہونے کا تصور اور دوم انسان اور اس کے جملہ افعال کے مخلوق ہونے کا تصور۔ خالق ہر فعل میں خالق ہے اور مخلوق اپنی ہر صفت میں مخلوق۔

خدا اور اس کی ذات و صفات کے سوا چونکہ کائنات کی ہر ادنیٰ و اعلیٰ چیز مخلوق ہے، اس لیے کائنات اور اس میں وقوع پذیر ہونے والے اعمال و افعال بھی مخلوق ہیں، جن کی من حیث الوجود، تخلیق تو باری تعالیٰ نے کی ہے، مگر کسب و ارتکاب انسان اپنی رضا و رغبت سے کرتا ہے۔ اس لیے اب اس سوال کا جواب کہ انسان کی اپنے افعال کی طرف کیا نسبت ہوگی۔ قرآن کریم یہ واضح کرتا ہے کہ انسان اپنے افعال کا خالق نہیں، بلکہ کاسب، مکتسب اور مرتکب ہے۔ ارشاد

فرمایا گیا:۔

بَلَىٰ مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً  
وَأَحَاطَتْ بِهِ خَطِيئَتُهُ  
فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ  
هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۗ

ہاں جو برے کام کرے اور  
اس کے گناہ ہر طرف سے اس کو  
گھیر لیں تو ایسے لوگ دوزخ میں جانے والے  
ہیں اور وہ ہمیشہ ہمیشہ اس میں جلتے رہیں گے۔

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا  
مَا اكْتَسَبَتْ ۗ

اگر اس نے نیک کام کیے (یعنی  
اعمال کما ئے) تو اسی کو فائدہ پہنچے گا اور اگر  
برے کام کیے (یعنی اعمال کما ئے) تو اسی  
کو اس کا نقصان اٹھانا پڑے گا۔

جس طرح کائنات کی ہر چیز خدا کی مخلوق ہے۔ قطع نظر اس کے کہ وہ بڑی  
ہے یا چھوٹی، انسان ہے یا حیوان، جن ہے یا فرشتہ، سیارہ ہے ستارہ، زمین ہے  
یا کوئی اور خطہ، سمندر ہے یا خشکی جمادات میں سے ہے یا حیوانات سے، مادہ  
ہے یا توانائی، کوئی خارجی وجود ہے یا ذہنی تصور، کوئی عملی حقیقت ہے یا فکری  
تخلیق، ہر چیز اپنے وجود میں خدا تعالیٰ کی سفت خلایقیت و صنایعی کی آئینہ دار اور  
اپنے ہونے اور باقی رہنے میں اسی کی محتاج ہے اور اس کا خالق صرف اللہ ہے،  
اسی طرح انسان جو بھی عمل کرتا ہے، مثلاً اس کا گفتگو کرنا، اس کا آرام کرنا، اس کا کھینا  
کو دنا، اس کا حوائج ضروریہ کی تکمیل کرنا، اس کا اٹھنا بیٹھنا، اس کا چلنا پھیرنا، آنا جانا، اس  
کا ہر کام اپنے وجود میں ایک فعل اور عمل ہے۔ اور ہر فعل ایک وجود ہونے کے

۱۰ البقرہ (۲: ۸۱)

۱۱ البقرہ (۲: ۲۸۶)

اعتبار سے خدائی مخلوق ہے۔ کیونکہ فعل بھی انسان ہی کی طرح انفس و آفاق پر مشتمل اسی کائنات کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ لیکن اکتساب کی ذمہ داری کے اعتبار سے اس فعل کو انسان کا فعل کہیں گے خدا کا نہیں۔ چنانچہ اس کی نسبت بہر حال انسان کی طرف ہی ہوگی، جیسے کہ مذکورہ بالا آیت میں الفاظ ”وَمَا تَعْمَلُونَ“ (اور جو تم عمل کرتے ہو) میں فعل کے انجام دینے کی ذمہ داری انسان پر عاید کی گئی ہے۔ گویا عمل ایک ہے، مگر اس کے پیلو دو ہیں، ایک پہلو کے اعتبار سے وہ خدا تعالیٰ کی مخلوق ہے اور دوسرے کے اعتبار سے انسان کا مکسوب۔ اس تصور کو سمجھنے کے لیے بچے کے تخلیق کے عمل ہی کو لیجئے: ہر شخص جانتا ہے کہ بچہ محض مرد و عورت کے رشتہ ازدواج میں منسلک ہو جانے ہی سے پیدا نہیں ہو جاتا، بلکہ اس کی پیدائش کے لیے ”امرازی دی“ کی بھی اشد ضرورت ہوتی ہے، کتنے ہی جوڑے ایسے ہیں کہ برسہا برس گزر جانے کے باوجود ان کے دامن بچوں کی نعمت سے محروم رہتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بچے کی تخلیق میں بیادی عمل و فعل درشتہ ازدواج کا ہی ہوتا ہے۔ گویا کبیا تو بچے کو جو ڈوالدین کے دم قدم سے ملا، لیکن خلقاً یہ خدا تعالیٰ کی عطا کارہین منت ہے۔ ۱۰

۱۰ اسی لیے قرآن کریم میں ایسے ”جوڑوں“ کو بدعت منقید بنایا گیا ہے کہ جو اولاد کی نعمت کو اپنی طرف یا کسی اور سفلی ذریعے کی طرف منسوب کرتے ہیں، ارشاد ہے:

فَلَمَّا أَتَاهُمْ مَا صَالِحًا  
جَعَلْنَاهُ شُرَكَاءَ وَفِيْمَا  
أَشْتَبَعْنَا فَمَلَّ اللَّهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ

پس جب خدا تعالیٰ نے ان کو صحیح و سالم  
بچہ عطا کر دیا تو وہ اس کے خلق میں شریک  
مٹھرانے لگے، حالانکہ اللہ تعالیٰ شریک کیسے  
جانے سے بلند و بالا ہے۔

(الاعراف، ۱۶۰: ۱۹۰)

حالانکہ اولاد کی نعمت عطا کرنا، یا اس سے محروم رکھنا اور اسی طرح دیگر انسانی حاجات کی تکمیل کرنا  
خاصتہ اللہ رب العزت کا فعل ہے۔

اسی طرح ہر انسانی عمل اپنے کسب میں انسانی ہمتوں کا محتاج ہے، مگر اپنے وجود اور اپنی ہستی میں خدا تعالیٰ کے حکم "کن" کا دستِ نگر ہے۔

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ  
کیا مخلوق ہونے کے لیے دیکھا جانا ضروری ہے؟  
انسانی عمل دیکھنے میں تو

انسان ہی کی تخلیق محسوس ہوتا ہے اسے انسانی کسب سے الگ ایک مخلوق کس طرح مان لیا جائے۔ اس لیے سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا ہر مخلوق کے لیے الگ طور قابل دید ہونا

بھی ضروری ہے؟ یا نہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ ہر مخلوق بحیثیت ایک مخلوق کے، ہر ایک کے لیے مرنی نہیں ہوا کرتی۔ قرآن کریم میں قسم کھا کر یہ کہا گیا ہے:

فَلَا أَقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُونَ ۝

وَمَا لَا تُبْصِرُونَ ۝  
قسم ہے ان چیزوں کی جن کو تم دیکھتے ہو اور جن کو تم نہیں دیکھ سکتے۔

سائنس بھی اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ دنیا میں بہت سی اشیاء موجود ہونے کے باوجود نظر نہیں آسکتیں، مثلاً اس کمرے میں نموں کے حساب سے ہوا موجود ہے۔ مگر یہ ہوا انسانی آنکھ یا خوردبین کے ذریعے نہیں دیکھی جاسکتی۔ اسی طرح انسانی آواز مخلوق ہے، اگر محوڑی دیر کے لیے کان بند کر لیے جائیں تو آنکھوں اور دوسرے حواس کی مدد سے اس کا ادراک نہیں کیا جاسکتا۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ کسی چیز کا مرنی ہونا (یعنی دکھائی دینا) اس وقت ضروری ہے، جبکہ اس کا طبعی وجود کیفیت ہو اور دوم یہ کہ اس کو محسوس اور معلوم کرنے والی خاص حس اپنی صحیح حالت میں ہو۔ جو اشیاء غیر حسی ہوں یا ان کو محسوس کرنے والے حواس میں نقص ہو تو ایسی صورت میں کوئی چیز خارج میں پائے جانے کے باوجود محسوس نہیں کی جاسکتی۔

خود انسان حسی اور کیفیت وجود رکھتا ہے اس لیے اس کا موجود ہونا آنکھوں سے



دیکھا جاسکتا ہے، مگر اس کا عمل بذاتِ خود ایک لطیف وجود ہے، لہذا اس کے اثرات و نتائج کا تو ہم مشاہدہ کرتے ہیں اور اس کے ارتکاب میں استعمال ہونے والے اعضاء کو تو ہم دیکھ سکتے ہیں مگر ان اعضاء و جوارح اور اثرات و نتائج سے قطع نظر فی نفسہ عمل کے وجود کو محسوس نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی مثال بالکل ایسے ہے کہ رحم اور محبت حقیقت میں اپنا اپنا وجود تو رکھتے ہیں۔ لیکن جب تک انہیں آپ ماں کی مانتا، باپ کی شفقت اور دوست کے اخلاص کے روپ میں نہ دیکھیں، ان کا وجود از خود دکھائی نہیں دے سکتا۔ یعنی انہیں دیکھنے کے لیے کسی رحم دل شخص کے عمل اور کسی محبت کرنے والے کے التفات کا سامنے ہونا ضروری ہے۔ اگر یہ انسانی یا حیوانی طرف نہ ہوں تو رحم، غصہ، محبت، نفرت، بغل جرح اور تکبر وغیرہ جیسے اوصاف دکھائی نہیں دے سکتے۔ گویا اوصاف کے وجود کا انکار ممکن نہیں۔ لیکن ان کے ظہور کے لیے کسی منظر کا ہونا ضروری ہے۔ ان کے پائے جانے کا انکار ممکن نہیں مگر انہیں سمجھنے کے لیے کوئی ذریعہ چاہیے۔ جو شے خود ایک لطیف یا غیر حسی وجود رکھتی ہو اسے معلوم کرنے کے لیے اس کا اتصال کسی حسی اور کثیف حقیقت سے ہونا ضروری ہے۔ جیسے جان جسم کے بغیر دکھائی نہیں دیتی، اسی طرح عمل، کسی عامل کی شکل میں دکھائی دیتا ہے۔ اس کے بغیر نہیں۔ لہذا عامل کو، عمل کا خالق نہیں بلکہ اس کا سبب تصور کیا جائے گا۔ کیونکہ اس نے عمل کو فی نفسہ پیدا نہیں کیا بلکہ اسے کر کے دکھایا ہے۔

قرآن کریم یہ حقیقت

بھی پوری طرح واضح

جزا و سزا کا تعلق کسب سے ہے نہ کہ خلق سے

کہ دیتا ہے کہ اگرچہ ہر انسانی عمل تخلیق کے اعتبار سے تو مخلوقِ خدا ہے، لیکن صدور اور ظہور کے اعتبار سے انسان کا کسب ہے اور کسب و ارتکاب چونکہ آزادانہ ہے

اس لیے وہی اپنے عمل کے انجام کا ذمہ دار ہے کیونکہ جزا و سزا کا تعلق کسب اعمال سے ہوتا ہے نہ کہ خلق اعمال سے۔ اسی بنا پر سورۃ الملک میں انسانی تخلیق کا مقصد واضح کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا:

اس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ

أَلَمْ نَخْلُقَ الْمَوْتَ

تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں سے کون

وَالْحَيَاةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ

اچھے عمل کرتا ہے۔

أَحْسَنُ عَمَلًا ۗ

موت و حیات بھی اپنی تخلیق کے اعتبار سے، خدا تعالیٰ کی مخلوق ہیں، مگر اپنے واقع ہونے کی مناسبت سے، ان کا وجود کسی نہ کسی سبب کا رہین منت ہے۔ اسی طرح اعمال بھی تخلیق کے اعتبار سے مخلوق باری تعالیٰ ہیں، لیکن ان کا وجود میں آنا انسان کا رہین منت ہے۔ زندگی، اعمال کے ارتکاب کا سبب بنتی ہے اور موت عالم آخرت میں ان کے نتائج کے مشاہدے کا۔ دنیا میں موت و حیات کی تخلیق کی غرض و غایت بھی یہی ہے کہ یہ دیکھا جاسکے کہ کون اچھے اعمال اپناتا ہے اور کون بُرے۔ اسی تصور کو قرآن کریم دوسری جگہ واضح کرتا ہے:

اور جو مصیبت تم پر نازل ہوتی ہے

وَمَا آتَاكُمْ مِنْ

سو وہ تمہارے اعمال ہی کا نتیجہ ہوتی ہے۔

مُصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ

أَيْدِيكُمْ ۗ

۱ الملک (۲:۶۶)

۲ الشوریٰ (۳:۴۲)

ایک دوسری جگہ اسی حقیقت کو یوں بیان کیا گیا ہے:

(باقی آئندہ صفحے پر)

یعنی انسان دنیا میں جن نقصانات، مشکلات اور آزمائشوں سے دوچار ہوتا ہے

وہ سب اس کے اپنے اعمال کے نتائج و ثمرات ہیں۔

یہ تو انفرادی شعبہ حیات سے تعلق رکھنے والی مصیبتوں کا ذکر تھا، دوسری جگہ

اجتماعی زندگی کی مشکلات کو بھی لوگوں کے اپنے اعمال کے نتائج قرار دیا گیا۔ ارشاد

فرمایا گیا:

خشکی اور تری میں لوگوں کے اپنے

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ

اعمال کے سبب سے فساد پھیل گیا ہے

وَالْبَحْرِ يَمَّا كَسَبَتْ آيْدِي

تاکہ وہ لوگوں کو ان کے بعض اعمال کا بدلہ

النَّاسِ يُذِيبُهُمْ

چکھائے۔

بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَهُ

اس دنیا میں نیکی یا بدی کا خلقی وجود کو من جانب اللہ ہے، مگر اس میں کوئی

شبه نہیں ہونا چاہیے کہ ان کے کسب کی ذمہ داری ان کے خالق پر عائد نہیں ہوتی

(از صفحہ گزشتہ)

تمہیں جو اچھائی پہنچتی ہے وہ خدا کی

مَا آتَاكَ مِنْ حَسَنَةٍ

طرف سے پہنچتی ہے اور جو برائی پہنچتی

فَمِنَ اللَّهِ وَمَا آتَاكَ مِنْ

ہے وہ تمہاری اپنی طرف سے ہے۔

سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَفْسِكَ

(النار - ۶۹: ۴)

مگر نعمت کے حصول میں تو خدا اتنا نیک و لطف و کرم شامل ہوتا ہے، مگر مصیبت کے

وقوع میں خالصتاً انسان کی اپنی غلطیوں کا عمل دخل ہوتا ہے، اگرچہ ہر اچھائی اور برائی کی خلقت

ہوتی من جانب اللہ ہے۔ لیکن ادب بندگی یہی ہے جس کی اوپر تعلیم دینی جا رہی ہے۔

۱۷ الروم (۳۰: ۴۱)

اس لیے کہ اللہ کا فعل مطلقاً خلق ہے نہ کہ کسب و ارتکاب۔ خلق کا مقصد یہ تھا کہ انسان کو اچھائی اور برائی میں تمیز کا شعور اور اختیار بخشا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ انسان عمل کے کس پہلو کو اختیار کرتا ہے۔ پھر ہر عمل کی تخلیق کے ساتھ ساتھ ہدایت ربانی کے ذریعے اس عمل کے نتائج و عواقب سے بھی انسان کو باخبر کر دیا جاتا ہے ان تمام باتوں کے باوجود اگر کوئی شخص اپنی مرضی سے فتنہ و شر اور بدی کا راستہ اختیار کرے تو وہ اپنے اعمال کی جزا و سزا کا ذمہ دار کیوں نہ ٹھہرایا جائے؟۔

ایک غلط فہمی اور اس کا جواب | اس تفصیل سے یہ مسئلہ اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ انسان سے اگر مواخذہ

ہوتا ہے تو اس لیے کہ وہ بقائم ہوش و حواس، اپنی مرضی اور اپنے ارادہ و اختیار سے کسی عمل کا ارتکاب کرتا ہے۔ لہذا یہ کہنا بے سود ہے کہ جب ہر عمل کا خالق اللہ تعالیٰ ہے تو انسان کو کیوں لائق تعزیر کر دانا جاتا ہے؟ انسان کو بلا وجہ نہیں پکڑا جاتا، اس کی گرفت اس کے سبب و اختیار کا نتیجہ ہوتی ہے۔

۱۔ یہی غلط فہمی مشرکین مکہ میں بھی موجود تھی، چنانچہ وہ کہا کرتے تھے:

لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا اشْرَكْنَا  
وَلَا آبَاءُنَا وَلَا حَرَمَنَا  
مِنْ شَيْءٍ (الانعام - ۶، ۷)

اگر خدا تعالیٰ چاہتا تو ہم اور ہمارے  
باپ دادا اس کے ساتھ کسی کو شریک  
نہ ٹھہراتے اور کسی چیز کو اپنی مرضی سے حرام  
نہ ٹھہرا سکتے۔

مگر اس کے جواب میں ان سے کہا گیا کہ محض برائی کا وجود اس کے جائز ہونے کا ثبوت نہیں ہو سکتا، برائی اور اچھائی تو ازل سے موجود ہے۔ اور اسی غرض کے لیے ہے کہ کتاب کے حوالے سے لوگوں میں اچھے اور بُرے کا امتیاز پیدا ہو سکے۔



خدائی فعل "خلق" کی حقیقت تو فقط اتنی ہے کہ اس نے اپنی دوسری بہت سی مخلوقات کی طرح انسانی اعمال کو بھی تخلیق کیا اور انسان کو بھی پیدا کر کے اسے اختیار دے دیا کہ وہ جس قسم کے اعمال چاہے اپنے لیے منتخب کرے۔ اس لیے انسان اپنے اختیار سے اعمال کا جو چناؤ کرے گا اور جس قسم کے اعمال کو اپنے کسبِ ارتکاب کے لیے مختص کرے گا وہ اسی طرح کی جزایا سزا کا مستوجب ہوگا۔ اگر غور کیا جائے تو صاف نظر آجاتا ہے کہ اس پوری کائنات میں ذمہ داریوں کا نظام بھی کسب پر ہی چل رہا ہے نہ کہ خلق پر۔

خدا تعالیٰ نے ہر چیز کی ضد پیدا کی ہے، دن کے ساتھ رات۔ آرام کے ساتھ بے آرامی، راحت کے ساتھ تکلیف، خیر کے ساتھ شر، حق کے ساتھ باطل، صدق کے ساتھ کذب، رحم کے ساتھ ظلم، نیکی کے ساتھ بدی اور جنت کے ساتھ دوزخ۔ اب محض ایک چیز کا موجود ہونا اس کے اپنے کی ذمہ داری سے برأت کی دلیل نہیں ہو سکتا۔ اگر خدا تعالیٰ نے سائے کے ساتھ دھوپ کو پیدا کیا تو اس لیے نہیں کہ کوئی سخت گرمی میں دھوپ میں جا بیٹھے اور کسی تکلیف کے واقع ہو جانے کے بعد، وہ یہ کہے کہ میری تکلیف کا باعث خدا تعالیٰ کا دھوپ کو پیدا کرنا ہے؟ اس صورت میں اس کے اس قول پر کون شخص یقین کرے گا؟ اٹا ہر کوئی اسی کو کہے گا کہ خدا تعالیٰ نے دھوپ اور سائے کی تخلیق تو اس لیے فرمائی تھی کہ انسان کو گرمیوں میں سائے اور سردیوں میں دھوپ دونوں کی راحت مہیا کرے۔ دھوپ کی تخلیق کا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ کوئی شخص بلا مقصد برہنہ سر یا برہنہ پا چل پلاتی دھوپ میں چلے پھرے اور خواہ تو وہ کسی تکلیف سے دوچار ہو جائے اگر خود انسان نے اس کا استعمال غلط طریقے پر کیا تو اس سے تخلیق کا کیا قصور ثابت ہوا۔

## (ب) انسان کے مختار یا مجبور ہونے کا مسئلہ

مسئلہ تقدیر کے ضمن میں ایک مسئلہ انسان کے مجبور یا مختار ہونے کا بھی ہے کہ آیا انسان کو مکمل طور پر مختار سمجھا جائے یا مجبور محض۔ لہٰذا اس ضمن میں حقیقت بالکل واضح ہے کہ انسان نہ تو کلیتہً ایسا مختار ہے کہ اس پر کوئی قدغن ہی نہ ہو اور نہ ہی ایسا مجبور کہ وہ خود کو ہر ذمہ داری سے بری قرار دے سکے۔ انسان کی حقیقی حیثیت "بین القدر والنجبر" ہے جو ایک معتدل کیفیت سے عبارت ہے۔ فی الواقع اسے اختیار و ارادے کی مکمل آزادی ہے لیکن اس کی آزادی میں نہ افراط ہے نہ تفریط۔

منقول ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے  
**حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد** | کسی نے اس مسئلے کی بابت استفسار کیا

تو آپ نے سائل سے فرمایا کہ اپنی ایک ٹانگ اور اٹھاؤ، اس نے اٹھالی، پھر فرمایا کہ اب دوسری بھی اٹھاؤ، اس نے عرض کیا: یہ تو ناممکن ہے، فرمایا کہ پہلی حد انسان کے اختیار کی تھی اور دوسری حد اس کی مجبوری کی ہے۔ یعنی اس کا اپنا توازن اسے اختیار کی ایک خاص حد سے آگے گزرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

لہٰذا تاریخ اسلام میں ایسے متعدد فرقوں کا ذکر ملتا ہے جن میں سے بعض کا یہ خیال تھا، کہ انسان مکمل طور پر مجبور ہے، اور وہ ایک تنگے کو بھی اپنی مرضی سے ہلانے کا اختیار نہیں رکھتا، جب کہ ان کے بالمقابل بعض ایسے لوگ بھی تھے جو انسان کو مکمل طور پر آزاد اور خود مختار قرار دیتے تھے۔ حالانکہ قرآن و سنت کی روشنی میں جو حقیقت سامنے آتی ہے وہ "بین القدر والنجبر" ہے۔

## بین القدر والجزر کا مفہوم

بین القدر والجزر کے تصور کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے ان مراحل کو سمجھا جائے جن سے گزر کر کوئی عمل تکمیل پذیر ہوتا ہے۔

سب سے پہلے انسان کے دل میں کسی کام کو کرنے یا نہ

### ۱۔ فرض اور خواہش میں کشمکش کا مرحلہ

کرنے سے متعلق ایک کشمکش پیدا ہوتی ہے یعنی اسکا فرض اور اسکی آرزو بیک وقت اس کے سامنے آتے ہیں اور پھر وہ اس احساس سے دوچار ہوتا ہے کہ یہ کام کرے یا نہ کرے۔

یہاں یہ امر پیش نظر رہے کہ یہ احساس صرف شعوری اور اختیاری

اعمال سے متعلق ہوتا ہے۔ جو اعمال غیر شعوری اور غیر اختیاری طور پر صادر ہوتے ہیں۔ اور جنہیں اضطراری اعمال کہا جاتا ہے، ان کا ان مراحل سے کوئی تعلق نہیں

اور نہ ہی ایسے اعمال پر گرفت ہوتی ہے۔ مثلاً اس کی مثال یوں سمجھیے کہ اگر کوئی شخص آپ کی آنکھ میں سوئی بھجونا چاہے اور اس کے خوف سے آپ کی پلکیں

اضطراری طور پر بند ہو جائیں۔ تو یہ ایک اضطراری فعل ہے اور ایسا فعل قابل مواخذہ نہیں، لیکن اگر یہی پلکیں بدینتی سے کسی فعل ناحق کے لیے حرکت کریں، تو

یہ اختیاری اور ارادی فعل ہوگا اور اس پر گرفت ہوگی۔ حرکت ایک ہی ہے مگر ارادے اور نیت نے اسے کچھت کچھ بنا دیا۔

بہر حال اولاً ذہن میں ایک کشمکش سی پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً کسی مال دیکھ کر

اسے ناجائز طور پر ہتھیانے کی خواہش پیدا ہوتی۔ اور دوسری طرف خدا کے حکم

نہی کا بھی خیال آگیا۔ نتیجہً دونوں خیالات ابھرے اور ذہن میں ایک کشمکش سی

م شروع ہو گئی۔ اسی لیے اس ابتدائی سوچ کے مرحلے کو کشمکش کا مرحلہ کہا

گیا ہے۔

۲ غور و خوض کا مرحلہ | اس کے بعد غور و خوض کا مرحلہ شروع ہو جاتا ہے، ذہن دونوں چیزوں کے ممکنہ نتائج

یعنی فوائد و نقصانات کا جائزہ لیتا ہے، وہ حتمی حکم پر بھی نظر ڈالتا ہے اور دنیوی منافع پر بھی اس طرح فعل کا ذہنی وجود کش مکش کے ابتدائی مرحلے سے گزر کر غور و خوض کے مرحلے میں داخل ہو جاتا ہے۔ کشمکش اور غور و خوض کے دونوں مرحلوں پر انسانی ذہن کسی قسم کی مجبوری اُپاندی (COERSION & COMPULSION) کا شکار نہیں ہوتا۔ یہ دونوں عمل ذہن اور شعور کی سطح پر آزادانہ طریقے سے واقع ہوتے ہیں۔

۳۔ انتخاب نیت کا مرحلہ | اس کے بعد اگلا مرحلہ ذہنی فیصلے کا ہوتا ہے یہاں پہنچ کر انسان دو راستوں

میں سے ایک کا انتخاب کرتا ہے۔ اور پوری سوچ بچار کے بعد اسے یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ وہ اچھائی کا مرکب ہو یا برائی کا، صحیح راستے پر گامزن ہو یا غلط پر اور فرض کی پیروی کرے یا خواہش نفس کی، اسی ذہنی فیصلے کو انتخاب نیت کہتے ہیں۔ یہاں تک انسان اپنے ذہنی عمل سے گزرتا ہے، آپ ٹھنڈے دل سے سوچ کر بتائیے کہ کیا ان تینوں مرحلوں میں کسی اعلیٰ قوت نے انسان کو مجبور کیا ہے اسے خواہش کو اختیار کرنے یا فرض پورا کرنے کے درمیان غور و خوض پر کسی طرف سے خارجی دباؤ پڑا ہے ہرگز نہیں، یہ تو خلتنا ذہنی قلبی اور داخل عمل تھا۔ آپ نے مسئلے کے ہر پہلو کو اچھی طرح سے دیکھا اور پرکھا، ایک کش مکش اور ذہنی تضادم کے مرحلے سے گزر کر سوچ بچار کے نتیجے میں ذہنی فیصلے کے مرحلے تک پہنچے۔ یہاں تک عمل مکمل طور پر آزاد ہے۔

۴۔ عزم و ارادے کا مرحلہ | اس کے بعد عزم و ارادے کا مرحلہ آتا ہے۔

جہاں پہنچ کر آپ اپنے ذہنی فیصلے یعنی نیت کو واقعہ بنانے اور اسے عمل جامہ پہنانے کے لیے ذہنی طور پر کمر بستہ ہو جاتے ہیں یہاں نیت اور ارادے میں فرق پیش نظر ہے کہ نیت، ذہنی سطح پر کسی چیز کو منتخب کرنے اور ارادہ اس نیت کی تکمیل پر ذہن کے کمر بستہ ہو جانے کا نام ہے۔ گویا ارادہ، نیت کے انتخاب سے جنم لیتا ہے، نیت مقدم ہوتی ہے اور ارادہ مؤخر، لہذا ارادہ ہمیشہ نیت کے تابع ہوتا ہے۔

۵۔ تکمیل کا مرحلہ | اس کے بعد پانچواں مرحلہ ارادے کی تکمیل کا آتا ہے۔ جہاں پہنچ کر انسان عمل قدم اٹھاتا ہے۔ عمل

تدبیر کے لیے سرگرم ہو جاتا ہے۔ اگر آپ نے بالفرض کسی دشمن کو مارنے کا ارادہ کر لیا ہے تو آپ کے عمل کا پانچواں مرحلہ کسی ہتھیار کے ساتھ اس پر حملہ کرنا ہوگا۔ لہذا تکمیل ہمیشہ ارادے کے تابع ہوتی ہے۔

۶۔ نتیجہ عمل کا مرحلہ | جب ارادے کی تکمیل ہو چکی تو اب اس عمل کے نتیجے کے برآمد ہونے کا مرحلہ آتا ہے۔ مثلاً ہتھیار

استعمال کرنے سے وہ شخص مر جائے یا زخمی ہو جائے گا۔ یہ نتیجہ آپ کے مرحلہ تکمیل کے تابع ہے جبکہ مرحلہ تکمیل خود عزم و ارادے کے تابع ہے۔ اور انتخاب نیت کا مرحلہ خود کسی شے کے تابع نہیں، کیونکہ وہ محض غور و خوض کے نتیجے میں وجود میں آیا تھا۔

یہ ہیں چھ مراحل جن سے کوئی عمل گزار کر اپنے نتیجے کے مرحلے تک پہنچتا ہے۔ بتائیے ان مراحل میں سے وہ کون سا مرحلہ ہے جہاں آپ پر کوئی خارجی دباؤ موجود تھا؟ ذہنی کش مکش سے لے کر نتیجہ عمل تک آپ خود بخود آگے بڑھتے چلے گئے

اسی اقدام کا نام "کسبِ عمل" ہے۔

بالفاظِ دیگر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ عمل کے چھ مرحلے دو حصوں میں تقسیم ہیں۔ پہلا حصہ ذہنی کشمکش سے شروع ہو کر انتخابِ نیت کا تھا، جبکہ دوسرا ارادے سے شروع ہو کر نتیجہ عمل تک محیط تھا۔ ان میں سے پہلے حصے میں آدمی خود مختار اور آزاد ہوتا ہے، لیکن دوسرے حصے میں خود اپنے انتخابِ نیت کا پابند۔ لیکن یہ مجبوری کیسی؟ خود اپنی سوچ اور نیت کی مجبوری۔ اسی لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اعمال کا دار و مدار نیت پر ہے۔

إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ

مزید فرمایا:

بلاشبہ خدا تعالیٰ تمہاری شکلوں اور مالوں کو نہیں دیکھتے بلکہ تمہارے اعمال اور دلوں کو دیکھتے ہیں۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَنْظُرُ إِلَى صُورِكُمْ وَأَمْوَالِكُمْ وَلَكِنْ

يَنْظُرُ إِلَى قُلُوبِكُمْ وَأَعْمَالِكُمْ

گو خدا تعالیٰ کے ہاں عمل کی ذمہ داری کا فیصلہ انسان کی نیت اور اس کے نیت ارادے کے مطابق ہوتا ہے۔ جیسی نیت ہوگی ویسی ہی جزا اُسے عمل ہوگی، اسی بنا پر قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا:

اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی رضا

کی نیت سے اپنے گھر بار سے ہجرت کیے نکلے، پھر اس نے اسے موت آئے

وَمَنْ يَخْرُجْ مِنْ

بَيْتِهِ مِمَّا جَرَّ إِلَيْهِ اللَّهُ  
وَرَسُولُهُ ثُمَّ يَدْرِكُهُ

۱۰ البخاری، حدیث اول۔

۱۱ المسلم جلد ۲، ص ۳۱۰۔



الْمَوْتُ فَتَدُ وَقَعَ آجُرُهُ  
تو اللہ تعالیٰ پر اس کا اجر ثابت ہو گیا۔

عَلَى اللَّهِ لَهُ  
(یعنی اسے پورے عمل کی جزا عطا کی جائے گی)

کیونکہ خدا کی ذات یہ نہیں دیکھتی کہ اس کا یہ عمل اپنے انجام تک پہنچا یا نہیں؟  
بلکہ یہ دیکھتی ہے کہ اکتسابِ عمل میں اس کی نیت کیا تھی۔

قرآن و حدیث میں اسی بنا پر نیت کے اخلاص اور اس کی درستگی پر زور دیا گیا ہے اور اسی پر ہی تمام فوائد و ثمرات مرتب ہوتے ہیں۔ نیت سے ہی ایک شخص مخلص مسلمان اور نیت سے ہی ایک شخص منافق سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ زبان اور ظاہر کی حد تک قول دونوں کا ایک ہی ہوتا ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ انسان اچھائی یا برائی کے ارتکاب کے لیے جب اپنی نیت کا انتخاب کرتا ہے اس وقت وہ مکمل طور پر با شعور اور با اختیار ہوتا ہے۔ اسے دونوں راستوں میں سے کسی بھی راہ کو اپنانے کا اختیار حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ مرحلہ خالصتاً اس کے اپنے ذہنی فیصلے کا ہوتا ہے۔ اسی آزادی کی بنا پر وہ ”شخص“ ”با اختیار“ تصور کیا جاتا ہے۔ اور اس کے اسی اختیار کے باعث اس سے جو اہل طلبہ اور مواخذہ بھی ہوتا ہے۔ کیونکہ بقیہ تمام مراحل عمل اس کی آزادانہ منتخب شدہ نیت کے تابع ہوتے ہیں۔ رہا خارجی مجبوریوں اور حالات کی پریشانیوں کا دباؤ، تو اس کا اثر نیت کے مرحلے پر نہیں بلکہ عزم و ارادے کے مرحلے پر چوتھے مرحلے پر ہوتا ہے۔ کیونکہ عزم و ارادہ اصولی طور پر تو انتخابِ نیت کے تابع ہوتا ہے لیکن کسی مجبوری کے باعث یہ ارادہ، نیت (ذہنی طلب اور قلبی فیصلے) کے خلاف بھی ہو سکتا ہے۔ یعنی دل تو کچھ اور چاہتا ہو لیکن کسی مجبوری کے تحت ارادہ کسی اور کام

کا کرنا پڑے۔ گویا ذہن کسی کام کو نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا ارادہ کرنے پر مجبور ہو۔ اگر ایسی صورت حال ہو تو یہ فعل "جبر و اکراہ" کہلاتا ہے۔ اور جبر و اکراہ حالت انسطرار تک پہنچ جائے تو انسان سے

(EXTRIMI NICESSITY)

اخلاقی و قانونی ذمہ داری اور جوابدہی مرتفع ہو جاتی ہے۔ خدا کی ذات صحیح معنوں میں مجبور شخص کو سزا نہیں دیتی۔ لہذا یہ حالت "استثنیٰ" (EXCEMPTION) کی ہو گئی مگر اصول و کلیہ وہی رہا کہ ہر شخص اپنے آزادانہ انتخاب نیت کے باعث پابند جزا و سزا ہے۔

اس موضوع پر عقائد اسلامی کی کتاب مشرح "عقائد السننی" میں بڑی سیر حاصل بحث کی گئی ہے، اس بحث کے چند ضروری مقامات حسب ذیل ہیں علامہ نفاذانی فرماتے ہیں :

اور بندوں کو اپنے افعال کا اختیار حاصل ہوتا ہے۔ اس بنا پر اگر یہ افعال طاعت پر مبنی ہوں تو ان کا ثواب ملتا ہے اور اگر معصیت ہوں تو ان پر عذاب دیا جاتا ہے۔ فرقہ جبریہ کا یہ کہنا غلط ہے کہ بندے کو اپنے افعال کا کچھ اختیار ہی نہیں اس کی حرکات و سکنات تو محض جمادات کی حرکات کے مشابہ ہیں، جنہیں اپنے افعال پر نہ قدرت حاصل ہوتی ہے اور نہ قصد و اختیار، جس کی وجہ یہ ہے کہ اگر بندے کو اپنے افعال کا اختیار ہی نہیں تو اس کا

وللعباد افعال اختیاریۃ  
یشابون بہا ان کانت  
طاعة و لیاقبون علیہا  
ان کانت معصیۃ لا کما  
زعمت الجبریۃ انه لا  
فعل للعباد اصلاً وان  
حرکاتہ بمنزلۃ حرکات  
الجمادات لا تدرۃ علیہا  
ولا قصد ولا اختیار و  
هذا باطل و نالفرت  
بالضرورة بین حرکۃ

البطش وحركة الاربعاش  
 ونعلم ان اول باختیاره  
 دون الثاني ولانه لو لم  
 يكن للعبد فعل أصلاً  
 لصاح تكليفه، وان  
 يترتب استحقاق الثواب  
 والعقاب على افعاله ولا  
 اسناد الافعال التي تقتضي  
 سابقية المقصد والاختيار  
 اليه على سبيل الحقيقة  
 مثل صلي وكتب ومسام  
 بخلاف مثل طال القدم و  
 اسود لونه - ان الله  
 خالق والعبه كاسب و  
 تحقيقه ان هرف العب  
 تارته و ارادته الى  
 الفعل كسب و ييجاد الله  
 تعالى الفعل عقيب ذلك  
 خلق والمفتدور الواحد  
 داخل تحت التدرجين  
 لكن بجهتين مختلفتين

احكام الہی کا مکلف مہترایا جانا اور اس کا  
 ثواب و عذاب کا مستحق ہونا، نیز افعال کا  
 اس کی طرف منسوب ہونا کس طرح درست  
 ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ان افعال میں حرکت سے  
 پہلے قصد اور اختیار ہوتا ہے۔ اسی بنا پر یہ  
 کہا جاتا ہے کہ اس نے نماز پڑھی، اس نے  
 لکھا جو اشیا اس کی قدرت سے باہر ہیں  
 ان کے متعلق انداز مختلف ہوتا ہے۔ مثلاً  
 کہا جاتا ہے کہ اس نے روزہ رکھا جبکہ  
 لڑکا بڑا ہو گیا یا اس کا چہرہ سیاہ پڑ  
 گیا، افعال کی نسبت بندے کی  
 طرف نہیں کی جاتی۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ  
 خالق ہیں اور بندہ افعال کا کاسب ہے  
 اور تحقیق اس کی اس طرح ہے کہ بندہ  
 اس کام میں اپنی قدرت اور صلاحیت  
 صرف کرتا ہے، لہذا یہ کسب ہے اور  
 خدا تعالیٰ اس کی کوشش کے بعد اس فعل  
 کو موجود کر دیتا ہے یہ خلق ہے، ایک  
 ہی فعل دو قدرتوں سے وجود میں آتا ہے  
 لیکن دو مختلف جہتوں سے فعل اپنے وجود  
 کے اعتبار سے خدا کا فعل ہے۔ مگر

فان فعل مقدر واللہ تعالیٰ  
 بجهة الایجاد ومقدور  
 العبد بجهة الکسب کالارض  
 تكون ملکاً للہ تعالیٰ  
 بجهة التخلیوت وللعباد  
 بجهة ثبوت التصرف لہ

علامہ تفتازانی کی اس بحث سے یہ مسئلہ اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ اگرچہ  
 ہر چیز خدا تعالیٰ کے فعل خلق کے نتیجے میں وقوع پذیر ہوتی ہے۔ لیکن عملی طور پر  
 بندہ اپنے افعال میں کسب کا اختیار رکھتا ہے اور اسی اختیار کی بنیاد پر اپنے ہر  
 عمل کا ذمہ دار اور اس پر جزا و سزا کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔

۱ شرح عقائد النسفی، ص ۶۳ — ۶۶ مطبع علمی لاہور

چہرہ و قد  
اور  
تصویرِ عمل







انسان کے مجبور یا مختار ہونے، نیز انسان کے اپنے افعال کے کاسب ہونے، پر گذشتہ باب میں تفصیل سے اظہار خیال کیا جا چکا ہے، اس تمام بحث سے یہ بات اچھی طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ انسان اپنے افعال کا کاسب ہے، مگر خالق خداوند تعالیٰ کی ذات سے۔ نیز یہ کہ انسان کو کسبِ اعمال میں اختیار اور ارادے کی آزادی بھی حاصل ہے۔

اس بحث سے ایک نیا مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان کو اللہ رب العزت کی طرف سے اختیار کی جو دولت عطا کی گئی ہے، اس کا پس منظر اور سبب کیا ہے۔ انسان کو آخر مختار کیوں بنایا گیا؟ قرآن مجید میں اس سلسلے میں ایک جامع ارشاد ہے :-

إِعْمَلُوا مَا شِئْتُمْ إِنَّهُ  
بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ  
تم جو چاہو کرتے رہو، وہ (اللہ) تمہارے  
اعمال کو دیکھ رہا ہے۔

اس آیت مبارکہ کے تین الفاظ پر اگر غور کیا جائے تو مسدّد تقدیر کے تمام ممکنہ پہلوؤں سامنے آجاتے ہیں، اور اس بارے میں پیدا ہونے والے تمام شکوک و شبہات رفع ہو جاتے ہیں۔

۱۔ اِعْمَلُوا: تم عمل کرو؛ لفظ اِعْمَلُوا میں عمل کی نسبت انسان کی طرف کی گئی ہے، جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انسان اپنے افعال کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں

لہ حکم السجدہ (۲۱: ۲۰)

نہایت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ وہ اپنے افعال کے کسب میں محتاط ہے۔ اچھے یا بُرے عمل کرنے کی آزادی رکھتا ہے۔ وہ جس قسم کے اعمال چاہے کرے اور جس قسم کے اعمال سے چاہے، احتراز کرے۔ اس پر قدرت کی طرف سے کوئی دباؤ نہیں ڈالا جاتا۔

۲۔ مَا شِئْتُمْ: (جو تم چاہو) "إِعْمَلُوا" کے لفظ سے عملی آزادی اور خود مختاری

کا اظہار ہوتا ہے۔ جب کہ مَا شِئْتُمْ سے نگری، ذہنی اور قلبی آزادی کا ثبوت مہیا ہوتا ہے کہ انسان اپنی ذہنی پسند اور نیت کے انتخاب میں بھی جس قسم کی روش چاہے اختیار کر سکتا ہے۔ وہ نہ سوچ میں پابند اور مقید ہے اور نہ عمل و کردار میں۔

۳۔ إِنَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ: اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انسان

کے جملہ اعمال و افعال کو ذاتِ باری دیکھ رہی ہے تاکہ اسے جزا و سزا بھی دی جاسکے۔

اسے اگرچہ نظری، فکری اور عملی اعتبار سے آزادی اور خود مختاری دی گئی ہے، مگر

اس آزادی کے عطا کیے جانے کا مقصد اسے شہرے بہار کر دینا نہیں، بلکہ اسے

یہ احساس دلانا ہے کہ ہر عمل کو اپنے منطقی انجام تک پہنچایا جائے گا اور اسے

اپنی صوابدید کے مطابق کیے ہوئے اعمال پر بارگاہِ ایزدی میں جواب دہ ہونا ہوگا۔

قرآن حکیم کے مطالعے کی روشنی میں انسان کو آزادی دیتے جانے کے ہر مقاصد بیان

کیے جاسکتے ہیں جن کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

خداوند تعالیٰ کسی معاملے میں بھی اپنی کسی مخلوق پر ظلم

نہیں کرتا۔ اس کا ہر فعل عدل و انصاف پر مبنی ہوتا

ہے۔ اس نے اس کا رخائے قدرت کو قانونِ عدل ہی پر قائم رکھا ہوا ہے۔ وہ نہ صرف خود

عدل و انصاف کے تمام تقاضے پورے کرتا ہے بلکہ اپنے بندوں کو بھی یہ تعلیم دیتا ہے کہ

وہ کسی پر ظلم اور زیادتی نہ کریں۔ چنانچہ سورۃ المائدہ میں ارشاد ہے:

وَلَا يَجْبِرَنَّكُمْ شَنَاٰنُ  
اور بعض لوگوں کی دشمنی تم کو اس بات

تَوَدُّ عَلَىٰ أَنْ لَا تَعْدَلَ لُوَا  
إِعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ

پر آگاہ نہ کرے کہ انصاف چھوڑ دو۔  
دان سے بھی) انصاف کیا کرو کہ یہی پرہیزگاری  
کی بات ہے۔

دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

نَادَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ  
أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ

اور جب لوگوں میں فیصلہ کرنے لگو تو انصاف  
سے فیصلہ کیا کرو۔

عدل کی تعریف علماء لغت نے ان الفاظ میں کی ہے:

وَضَعَ الشَّيْءَ عَلَىٰ مَحَلِّهِ  
کسی چیز کو اس کے صحیح ٹھکانے پر رکھنا۔

دوسرے لفظوں میں حقدار کو حق دینا، مستحق کو اس کا جائز مقام دینا، عدل ہے،  
جب کہ اس کے برعکس روش اختیار کرنا ظلم و جور ہے۔ قرآن کریم ہر حال اور ہر صورت میں  
عدل کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ خواہ معاملہ اپنے کسی قریب ترین عزیز جتنی کہ ماں باپ کا ہو۔  
چنانچہ سورۃ النساء میں ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا  
كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ  
لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدِينَ  
وَالْأَقْرَبِينَ إِنْ يَكُنْ غَنِيًّا  
أَوْ فَقِيرًا فَاللَّهُ أَوْلَىٰ بِهِمَا فَلَا  
تَتَّبِعُوا هَوَايَ إِنْ تَعْدِلُوا

اے اہل ایمان! انصاف پر قائم رہو، اور  
خدا کے لیے سچی گواہی دو خواہ اس میں  
تمہارا یا تمہارے ماں باپ اور رشتہ داروں  
کا نقصان ہی ہو۔ کوئی امیر ہے یا فقیر خدا ان کا  
خیر خواہ ہے۔ تو تم خواہش نفس کے پیچھے چلنے کے  
عدل کو نہ چھوڑو۔

لہ النساء (۴: ۹۰)

لہ العادہ (۵: ۸)

لہ ام راتب الامعنیانی: مفردات القرآن، بذیل مادہ عدل۔

لہ النساء (۴: ۱۳)

دوسرے مقام پر عدل و انصاف کی تلقین کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ  
وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ

خدا تم کو انصاف اور احسان کرنے اور

رشتہ داروں کو (خرج سے مدد) دینے کا

حکم دیتا ہے۔

آیہ کریمہ میں عدل کے ساتھ ساتھ احسان کرنے کا  
حکم دیا گیا ہے۔ عدل کا مفہوم تو سطور بالا میں

عدل کا مقام رفیع — احسان

بیان کیا جا چکا ہے جب کہ احسان کا مقام عدل کے مقام سے بھی بلند ہے۔ حق دار کو اس کا  
حق دینا عدل ہے۔ اپنا حق کم لینا اور دوسرے کا حق زیادہ دینا احسان ہے۔ گویا احسان  
جو دو فضل اور لطف و کرم کا متقاضی ہوتا ہے۔ اس طرح نیکی کی زندگی کے دو مدارج بیان  
کیے گئے ہیں:

پہلا درجہ یہ ہے کہ عدل و انصاف کی زندگی بسر کرو۔ نہ کسی کا حق کھاؤ، نہ کسی کو اپنا  
حق کھانے دو۔ لیکن یہ درجہ بے حد احتیاط کا متقاضی ہے۔ اگر اس درجے سے ذرا ہٹی قدم  
لڑکھڑائے، یعنی معمولی سا بھی افراط و تفریط ہو جائے تو انسان درجہ ظلم پر پہنچ جاتا ہے،  
اس لیے نیکی اور تقویٰ کے نقطہ نظر سے ایک بلند تر درجہ بھی بیان کر دیا گیا ہے۔ یہ وہ مقام  
ہے جہاں انسان خدا نعلیٰ کا محبوب بن جاتا ہے:

ارشاد ہے:

إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ

بیشک خدا احسان کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے۔

یہ مقام احسان ہے، اس لیے فرمایا: کہ اگر ہو سکے تو عدل کے اونچے درجے پر نازل ہو۔

۱۔ النمل (۹۰: ۱۶)

۲۔ البقرة (۲: ۱۹۵)

حق دار کو اس کے حق سے بھی زیادہ دو۔ اور دوسروں کی خاطر اپنا حق لینا چھوڑ دو تاکہ اگر کبھی مقامِ اہسان سے اترنا بھی چاہو تو مقامِ عدل پر تو فائز رہ سکو۔

جو ذات اپنے بندوں کو ہر حال نظامِ عدل و احسان اپنانے کی تلقین کرے، جس کا اپنے بندوں سے مطالبہ یہ ہو کہ جب بھی اپنے یا کسی دوسرے کے متعلق فیصلے کا موقع آئے، تو عدل و انصاف کے اصولوں کے مطابق فیصلہ کر دے۔ وہ ذات جب خود مسندِ عدالت پر متمکن ہوگی تو کیا اپنے بندوں کے متعلق عدل و انصاف کے تقاضوں کو ملحوظ نہیں رکھے گی؟ وہ ذات تو سراسر عدل و انصاف ہے۔ قرآن کریم میں بار بار اللہ رب العزت کے انصاف کا ذکر کیا گیا ہے، سورۃ الانبیاء میں ارشاد ہے:

وَلَنَضَعُ الْمَوَازِينَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَإِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ أَتَيْنَا بِهَا ۗ

اور ہم قیامت کے دن انصاف کا ترازو قائم کریں گے؟ تو کسی شخص کی ذرا بھی حق تلفی نہ کی جائے گی اور اگر رائی کے دانے کے برابر بھی کسی کا عمل ہوگا تو اس کو لا حاضر کریں گے۔

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

وَدُونَيْتُ كُلِّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ۗ

اور ہر نفس اپنے اعمال کا پورا پورا بدلہ پائے گا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

ایک دوسرے مقام پر ”روزِ محشر“ کی منظر کشی کرتے ہوئے بیان کیا گیا ہے کہ اس دن ہر شخص کو اس کے اعمال کے مطابق فردِ عمل دی جائے گی۔ مہجرتین کو بائیں ہاتھ میں اور نیکو کاروں کو سیدھے ہاتھ میں۔ اس موقع پر ارشاد ہوگا:

سُورَةُ الْاَنْبِيَاءِ (۲۱: ۲۴)

سُورَةُ اَلْاٰمِرَانِ (۲: ۲۵)

(لے سرکش) یہ اس (کفر) کی سزا ہے جو تیرے  
ہاتھوں نے آگے بھیجا تھا اور خدا اپنے بندوں  
پر ظلم کرنے والا نہیں۔

ذِكْرَ مِمَّا قَدَّمْتُمْ لِأَيْدِيكُمْ  
وَأَنَّ اللَّهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ

اور یہ امر بھی واضح کر دیا گیا کہ خداوند تعالیٰ اپنے بندوں  
پر ظلم کے بجائے جہاں تک ہو سکے گا، لطف و کرم

خداوند تعالیٰ کی احسان پسندی

اور فضل و احسان کا برتاؤ فرمائے گا۔ اس سلسلے میں ارشاد ہے :

جو کوئی (خدا کے حضور) نیکی لے کر آئے گا،  
اس کو وہی دس نیکیاں ملیں گی اور جو بُرائی  
لائے گا، اس کو وہی سزا ملے گی اور اس پر  
ظلم نہیں کیا جائے گا۔

مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ  
عَشْرٌ أَمْثَلِهَا وَمَنْ جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ  
فَلَا يُجْزَى إِلَّا مِثْلَهَا وَهُوَ  
لَا يَظْلَمُونَ

ایک دوسرے مقام پر اس احسان پسندی کا یوں ذکر کیا گیا :

جو شخص نیکی لے کر آئے گا، اس کے لیے  
اُس جیسی دس نیکیاں ہیں، اور جو بُرائی لائے  
گا تو جن لوگوں نے بُرے کام کیے، ان کو بدلہ  
بھی اُسی طرح ملے گا جس طرح کے وہ کام  
کرتے تھے۔

مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ  
عَشْرٌ أَمْثَلِهَا وَمَنْ جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ  
فَلَا يُجْزَى الَّذِينَ عَمِلُوا  
السَّيِّئَاتِ إِلَّا مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ

جس خدا کا اپنے بندوں سے سلوک اور مہربانی کا یہ عالم ہو، اس کے متعلق مہلایہ کیونکر

۱۔ الحج (۲۲ : ۱۰)

۲۔ الانعام (۶ : ۱۶۰)

۳۔ القصص (۲۸ : ۸۳)



کہا جاسکتا ہے کہ اس نے انسان کی اچھی یا بُری تقدیر لکھ کر اُسے مجبور کر دیا ہے۔ نیز اگر اس کے حق میں کوئی بُرائی لکھی جا چکی ہے تو اس کی مخالفت کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

خدا تعالیٰ اگر بندے کو مجبور کرنا چاہے تو اُسے کوئی روک نہیں سکتا۔

قرآن کریم اس حقیقت کو خوب اچھی طرح واضح کرتا ہے کہ اگر خداوند تعالیٰ انسان کو مجبور کرنا چاہے تو کوئی اس کو روک نہیں

سکتا۔ اور اگر ایسا کیا جاتا تو اس مجبور دنیا کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا، چنانچہ فرمایا:

وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَكُمْ  
أُمَّةً وَاحِدَةً لَّ

اور اگر خدا چاہتا تو تم سب کو ایک ہی  
جماعت بنا دیتا۔

نیز فرمایا:

لَوْ شَاءَ اللَّهُ لَهَدَى  
أَجْمَعِينَ

اگر وہ چاہتا تو سب کو ہدایت دے  
دیتا۔

مگر ایسی صورت میں جزا و سزا کا تصور بے معنی ہو کر رہ جاتا اور انسان کو کسی جگہ بھی اپنی مرضی چلانے کا اختیار باقی نہ رہتا۔ اس کے برعکس خداوند تعالیٰ نے انسان کو غلی آزادی مرحمت فرمائی اور فرمایا:

إِصْلَوْا مَا شِئْتُمْ

جو چاہو، عمل کرو۔

یہ خداوند تعالیٰ کی طرف سے انسان کے آزاد اور مختار ہونے کی عقلی دلیل ہے۔

یہ امر اچھی طرح واضح کر دیا گیا ہے کہ خداوند تعالیٰ اپنے کسی بندے پر ادنیٰ وجہے کا ظلم بھی گوارا نہیں کرتا۔

جزا و سزا اور نظام عدل

لہ النحل (۹۳، ۱۶)

لہ الانعام (۶: ۱۵۰)

اسی سے نظام عدل کے ساتھ جزا و سزا کا تعلق بھی واضح ہو جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد فرمایا گیا:

إِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ<sup>۱</sup>  
تمہیں بدلہ دیا جائے گا جو تم کرتے تھے۔

دوسرے مقام پر مزید واضح کیا گیا:

وَأَنْ لَّيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَى<sup>۲</sup>  
اور یہ کہ انسان کو وہی ملتا ہے، جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔

ایک اور مقام پر اعلان ہوا:

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ عَلَيْهَا مَا كَسَبَتْ<sup>۳</sup>  
بندہ اچھے کام کرے گا، تو اُسے اس کا فائدہ ملے گا، بُرے کام کرے گا تو اُسی کو نقصان پہنچے گا۔

جزا اور سزا کے لیے اللّٰهُ رَبُّ الْعِزَّةِ الْكَبِيرِ کا ایک اہل انبیا ہے کہ وہ اس وقت تک کسی قوم پر عذاب نازل

جزا اور سزا اور امام حجت

نہیں کرتا جب تک امام حجت نہ کر لے۔ چنانچہ سورہ بنی اسرائیل میں ہے:

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا<sup>۴</sup>  
اور جب تک ہم پیغمبر نہ بھیج لیں عذاب نہیں دیا کرتے۔

۱۔ التحريم (۶: ۶۶)

۲۔ النجم (۳۹: ۵۳)

۳۔ البقرہ (۲۸۶: ۲)

۴۔ بنی اسرائیل (۱۷: ۱۵)

اِس سلسلے کا دوسرا اصول یہ ہے کہ:

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ - اور کوئی اٹھانے والا دوسرے کا

بوجھ نہ اٹھائے گا۔

اسی بنا پر قیامت کے روز ہر شخص خود اپنی نگر میں مبتلا ہوگا۔ چنانچہ سورہ عبس

میں ارشاد فرمایا:

يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ<sup>۱</sup>

اس دن بھائی اپنے بھائی سے ڈور بھاگے

وَأُمِّهِ وَأَبِيهِ<sup>۲</sup> وَصَاحِبَتِهِ<sup>۳</sup>

گا اور اپنی ماں اور اپنے باپ سے اور اپنی بیوی

وَبَنِيهِ<sup>۴</sup> بِكُلِّ امْرِيٍّ مِّنْهُمْ<sup>۵</sup>

اور بیٹوں سے نفور ہوگا۔ ہر شخص اس روز اپنی

يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ<sup>۶</sup>

نگر میں ہوگا۔

صرف یہی نہیں بلکہ وہ اس بات پر آمادہ ہوگا کہ اس کی جگہ اس کے تمام متوسلین اور

مقرنین کو کھڑا کیا جائے اور اس کی جان بخشی ہو جائے۔ چنانچہ سورہ المعارج میں ارشاد

فرمایا:

يَوْمَ الْمُجْرِمِ لَوْ يَفْتَدِي<sup>۱</sup>

عذاب کے بدلے میں (سب کچھ) دے دے

مِنْ عَذَابٍ يَوْمَئِذٍ بِنِيهِ<sup>۲</sup>

(یعنی) اپنے بیٹے اور اپنی بیوی اور اپنے بھائی

وَصَاحِبَتِهِ<sup>۳</sup> وَأَخِيهِ<sup>۴</sup> وَنَصِيئَتِهِ<sup>۵</sup>

اور اپنا خاندان جس میں وہ رہتا تھا اور زمین

الَّتِي تُوِيَّهُ<sup>۶</sup> وَمَنْ فِي الْأَرْضِ<sup>۷</sup>

پر جتنے بھی آدمی ہیں سب کچھ دے دے، اور

جَمِيعًا<sup>۸</sup> لَوْ يَنْجِيهِ<sup>۹</sup>

اپنے تئیں عذاب سے چھڑوائے۔

۱۔ فاطر (۳۵: ۱۸)

۲۔ عبس (۸۰: ۳۳-۳۴)

۳۔ المعارج (۷۰: ۱۱ تا ۱۲)

البتہ نیکو کار اور پرہیزگار لوگ اس ٹکھیے سے مستثنیٰ ہوں گے۔ اسی لیے فرمایا:

الْأَخِلَاءُ يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ  
لِبَعْضٍ عَدُوٌّ إِلَّا الْمُتَّقِينَ

جو آپس میں دوست ہیں، اس روز ایک  
دوسرے کے دشمن ہوں گے مگر پرہیزگار (کہ

باہم دوست ہی رہیں گے)

بالفاظِ دیگر اس روز سبھی پریشان اور متفکر ہوں گے۔ مگر خدا تعالیٰ کے وہ بزرگ و  
برتر بندے جو دنیا میں بھی دوسروں کی نکر میں غلطاں رہتے تھے، اس دن بھی اپنے  
بجائے دوسروں کی نکر میں مبتلا ہوں گے۔ اور اپنے اپنے وجہ اور رتبے کے مطابق  
خدا تعالیٰ کی بارگاہ سے منصبِ شفاعت پر سرفراز ہوں گے، مگر ان کی شفاعت،  
شفاعتِ صغریٰ ہوگی، جب کہ سب سے بڑی شفاعت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم  
کی ہوگی۔

بہر حال جب تک اتمامِ حجت نہ کر دیا جائے تو اہلِ مہل مبتلائے عذاب نہیں ہوتیں،  
چنانچہ ایک دوسرے مقام پر ارشادِ باری ہے:

وَإِذَا أَرَدْنَا أَنْ نَهْدِكَ  
تَرْبِيَةً أَمَرْنَا مُشْرِقِيهَا فَفَسَقُوا  
فِيهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنَا  
تَدْمِيرًا

اور جب ہمارا ارادہ کسی سستی کو ہلاک کرنے  
کا ہوا تو وہاں کے آسودہ لوگوں کو (خواہش پر)  
مامور کر دیا، وہ نافرمانیاں کرتے رہے،  
پھر اس پر عذاب کا حکم ثابت ہو گیا، اور ہم  
نے اُسے ہلاک کر ڈالا۔

دوسرے لفظوں میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے ہاں کسی صنابطے اور کسی قانون

۱۔ الزخرف (۲۳ : ۶۷)

۲۔ بنی اسرائیل (۱۷ : ۱۶)

کے بغیر کسی قوم کو ہلاک اور برباد کرنے کا اصول کارفرما نہیں، بلکہ جس لہتی اور جس قوم کو ہلاک کرنا مقصود ہوتا ہے، خداوند تعالیٰ اس لہتی اور اس قوم کی قیادت کی طرف (خواہ مذہبی قیادت ہو، یا سیاسی یا اقتصادی) حکم نازل کیا جاتا ہے، انہیں اطاعت اور فرمانبرداری کی ترغیب دی جاتی ہے۔ لیکن جب یہ وڈیرے نما لوگ خدا تعالیٰ کے احکام کی پروا نہیں کرتے اور خدا تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ آخری حد کو بھی عبور کر جاتے ہیں، تو پھر ان پر عذابِ خداوندی قہرین کر ٹوٹ پڑتا ہے اور ان کا نام و نشان صفحہ ہستی سے مٹا دیا جاتا ہے۔ کیونکہ جو قوم خود اپنی حالت بدلنا نہ چاہے، خدا تعالیٰ اس کی حالت کو نہیں بدلتا۔ اسی لیے سورۃ الرعد میں ارشاد فرمایا:

ان اللہ لا یغیر ما بقوم  
حتیٰ یغیروا ما بانفسہم  
خدا اس (نعمت کو) جو کسی قوم کو (حاصل) ہے، نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت کو نہ بدلے۔

انما حجت کا مفہوم یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ لوگوں کے سامنے اپنے انما حجت کا مفہوم | احکام کی اطاعت یا خلاف ورزی کے انجام و عواقب کو واضح فرمادیتا ہے۔ انہیں بتا دیا جاتا ہے کہ اطاعت کی صورت میں کیا صلہ اور خلاف ورزی کی صورت میں کیا سزا دی جائے گی۔ یہ سب کچھ جاننے کے باوجود کوئی قوم راہِ راست پر نہیں آتی تو پھر اس پر خدا تعالیٰ کی طرف سے حجت تمام ہو جاتی ہے اور خدا تعالیٰ اس پر اپنی گرفت مضبوط کر لیتا ہے۔ اسی لیے فرمایا:

لَسَلَّا یُکُونُ لِلنَّاسِ عَلَی اللّٰهِ  
حُجَّةٌ مَّا بَعْدَ الرَّسْلِ  
تاکہ رسولوں کی بعثت کے بعد خدا تعالیٰ پر لوگوں کی کوئی حجت نہ رہ جائے۔

۱۔ الرعد (۱۱: ۱۳)

۲۔ النساء (۴: ۱۶۵)

ذاتِ خداوندی انسان کی اس قدر سچی خیر خواہ ہے کہ اس پر عذاب نازل کرنے سے پہلے اس کو بار بار فہمائش کرتی ہے، محبت، پیار اور پھر ہلکی پھلکی ڈانٹ ڈپٹ سے اس کے گمراہی کی طرف بڑھنے والے قدموں کو روکنے کی سعی کرتی ہے۔ اُس ذات کا ارشادِ گرامی ہے کہ :

وَلَنذِيقَنَّاهُمُ الْعَذَابِ  
الَّذِي ادَّعَى دُونَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ  
لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ  
اور ہم ان کو (قیامت کے) بڑے عذاب  
کے سوا عذابِ دنیا کا بھی مزہ چکھائیں گے شاید  
(سباری طرف) لوٹ آئیں۔

اُس ذات کے متعلق بھلا یہ کیسے باور کر لیا جائے کہ اس نے انسان کو پیدا ہوتے ہی اپنی ازلی تقدیر کے شکنجے میں جکڑ کر مجبور اور بے بس بنا دیا ہے۔

الذَّيْبُ الْعِزَّتِ كِي طَرَفِ سِ الْاِنْسَانِ كُوتَيْبِرِ اتصَوْر  
اخلاقی جدوجہد،

الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ  
لِيَبْلُوَكُمْ اَيْحَسُّوا حَسَنًا عَمَلًا  
اسی نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ  
تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں کون اچھے  
عمل کرتا ہے۔

یعنی اچھے اور بُرے عمل جانچنے کے لیے کائنات کا یہ سٹیج سبب یا گیا، دوسری  
جگہ ارشاد فرمایا گیا :

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِي  
اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ  
ہم نے انسان کو بہت اچھی صورت میں  
پیدا کیا ہے۔ پھر (رفتہ رفتہ) اس کی

۱۔ السجده (۳۲ : ۲۱)

۲۔ الملک (۶۷ : ۲۱)



حالت کو بدل کر پست کر دیا۔ مگر جو لوگ ایمان اور نیک عمل کرتے رہے، ان کے لیے بے انتہا اجر ہے۔

اَسْفَلَ سَافِلِينَ ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ  
اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ  
اَجْرٌ غَيْرٌ مَّمْنُوْنٍ ۙ

ایک اور مقام پر ہے:

اور (قسم ہے) انسان کی اور اس کی جس نے اس کے (اعضاء) کو برابر کیا، پھر اس کو بدکاری (سے بچنے) اور پرہیزگاری (کرنے کی) کبھی دی جس نے اپنے نفس (روح) کو پاک رکھا، وہ مراد کو پہنچا اور جس نے اُسے خاک میں ملایا، وہ خسارے میں رہا۔

وَلَنْفُسٍ وَّمَا سَوَّاهَا ۙ  
فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوَاهَا ۙ  
قَدْ اَفْلَحَ مَنْ رَّكَهَا ۙ وَقَدْ خَابَ  
مَنْ دَسَّاهَا ۙ

ایک اور جگہ اس نکتے کی وضاحت یوں فرمائی:

جو لوگ بُرے کام کرتے ہیں، کیا وہ خیال کرتے ہیں کہ ہم ان کو ان لوگوں جیسا کر دیں گے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے، اور ان کی زندگی اور موت یکساں ہوگی۔ جو یہ دعوے کرتے ہیں، بُرے ہیں۔

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اٰجْتَرَحُوْا  
السَّيِّئٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ  
اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءٍ  
مَّحْيَا هُمْ وَمَمَاتُهُمْ ۗ سَآءَ  
مَا يَحْكُمُوْنَ ۙ

ان تمام آیات سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ خداوند تعالیٰ انسان کو

۱۔ التین (۹۵: ۲-۶)

۲۔ الشمس (۹۱: ۴-۱۰)

۳۔ النبی (۲۵: ۲۱)

اخلاقی جدوجہد اپنانے کی تلقین فرماتا ہے۔ یہی بھی ممکن ہے کہ انسان کو آزاد اور خود مختار گمان کیا جائے اور اگر خداوند تعالیٰ انسان کو پیدا کتنی طور پر اپنی قدرت کی زنجیروں میں اس طرح جکڑ دے کہ وہ بیچارہ اپنی مرضی سے نہ نیکی کر سکے، نہ بدی۔ تو اس کے ہاتھ بندھے ہوتے ہونے کی صورت میں اس سے جو کوئی نیکی صادر ہوتی ہے یا بُرائی سرزد ہوتی ہے، تو ایسی نیکی کو نیکی اور ایسی بدی کو بدی نہ کہتا جاسکتا۔ اس لیے کہ مجبور آدمی کی نہ نیکی اپنی ہوتی ہے اور نہ بدی۔

اس کی مثال اس طرح سمجھی جاسکتی ہے کہ اگر آپ کسی شخص کے ہاتھ پاؤں مضمبوط سے باندھ دیں اور اس کو پوری طرح بے بس اور بے دست و پا کرنے کے بعد اُسے کہیں کہ وہ آپ کی کسی سابقہ غلطی کو معاف کر دے تو اس حالت میں کیا دنیا کی کوئی عدالت عفو و درگزر کو کوئی اہمیت دے سکتی ہے؟ عفو تو وہی معتبر ہے کہ متعلقہ شخص انتقام لینے یا معاف کرنے پر قادر ہو اور انتقام نہ لے، معاف کر دے۔

گویا مجبوری کی حالت کو "اضطرار" تو کہہ سکتے ہیں، نیکی و بدی نہیں قرار دے سکتے۔ چنانچہ جب ہمارے دنیوی قوانین میں مجبوری اور اختیار میں اتنا فرق کیا جاتا ہے، اور جبر و اکراہ کی حالت میں کیا ہوا کوئی قول اور از نکاب کیا ہوا کوئی جرم معتبر نہیں سمجھا جاتا، تو اللہ تعالیٰ جس نے فرمانِ نبویؐ کے مطابق تخلیق کائنات کے وقت سے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ:

ان رحمتی سبقت غضبی لہ میری رحمت میرے غضب پر

غالب رہے گی۔

اس سے کیونکر یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ انسان کی اس بے بسی اور بے چارگی و

مجبوری سے غلط فائدہ اٹھائے گا۔ حاشا وکلا۔

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ حالت اضطرار

حالت اضطرار اور قانونِ اسلامی

میں شریعتِ اسلامیہ حلال اور حرام کی تفریق اٹھالیتی ہے اور جان بچانے کی غرض سے مہیتہ اور خنزیر تک کے گوشت کو کھانے کی اجازت دیتی ہے۔ چنانچہ سورۃ البقرہ میں ہے:

اس نے تم پر مراہو جانور اور خون اور سورا

گوشت اور جس پر خدا کے سوا کسی اور کا نام

پکارا جاتے، حرام کر دیا ہے۔ ہاں جو ناچار

ہو جائے (بشرطیکہ) خدا کی نافرمانی نہ کرے اور

حد (ضرورت) سے آگے نہ بڑھے، اس پر

کچھ گناہ نہیں۔ بے شک خدا بخشنے والا (اور)

رحم کرنے والا ہے۔

إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ

وَالدَّمَ وَالْخَمَّ الْخَنِزِيرِ وَمَا أُهِلَّ

بِهِ بِغَيْرِ اللَّهِ فَمَنْ اضْطُرَّ غَيْرَ

بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ

إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ

خدا تعالیٰ نے کتنا آفاقی، کائناتی اور عالمگیر تصور دیا ہے کہ حالت اضطرار میں حرام

تک کو مباح قرار دے دیا، دوسرے مقام پر فرمایا:

حالانکہ جو چیزیں اس نے تمہارے لیے

حرام ٹھہرا دی ہیں، وہ ایک ایک کر کے بیان

کر دی ہیں، مگر اس صورت میں کہ ان کے کھانے

کے لیے ناچار ہو جاؤ۔

وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَا حَرَّمَ

عَلَيْكُمْ إِلَّا مَا اضْطُرُّرْتُمْ إِلَيْهِ

۱۱۹ البقرہ (۲: ۱۷۳)

۱۲۰ الانعام (۶: ۱۱۹)

نیز فرمایا:

ہاں جو شخص سوگ میں ناچار ہو جائے (بشرطیکہ)

فَمَنْ اضْطُرَّ فِي مَخْمَسَةٍ

گناہ کی طرف، تو خدا بخشنے والا اور مہربان

ضَيْرٌ مَّتَّبَعٌ لَّا تَجْرِمُ وَلَا إِثْمَ

ہے۔

عَلَيْهِ، إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ

انہی وجوہ و اسباب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سورۃ الحج میں ارشاد فرمایا:

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ

اور تم پر دین کی کسی بات میں تنگی نہیں

کی۔

مَنْ حَرَجٌ

دوسرے مقام پر فرمایا:

خدا تعالیٰ کسی جان کو اس کی طاقت سے

لَا يَكْتُمُ اللَّهُ نَفْسًا

زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔

وَسَعَاءٌ

اور حضور سرِ ردِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

مجھے آسان دین دے کر بھیجا گیا ہے

بَعَثْتُ بِالْمَنْدُوبَةِ السَّنَةِ

اور اسلام سے قبل کی حالت کی منظر کشی کرتے ہوئے قرآن کریم بیان کرتا ہے:

اور ان پر سے بوجھ اور طوق جو ان کے سر

وَسَمِعَ عَنْهُمْ اصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ

پر اور گلے میں تھے، اتارتے ہیں۔

الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ

۱۰۰ الامد (۵: ۴)

۱۰۱ الحج (۲۲: ۷۸)

۱۰۲ البقرة (۲: ۲۸۶)

۱۰۳ مشکوٰۃ شریف، ۶، ۲۳۶

۱۰۴ الاعراف (۷: ۱۵۷)

یہ اعلان "واصر" کیا ہے؟ یہ غلط عقاید و تصورات کی زنجیریں اور توہمات کی پٹریاں  
 تھیں جن میں انسانیت کا بند بند حکم اٹھا ہوا تھا و حضورؐ کی بعثت کا ایک مقصد انسانیت کو  
 ان زنجیروں اور بندھنوں سے نجات دلانا بھی تھا، اسی بنا پر ارشاد خداوندی ہے:  
 وَمَا آذْرَاكُمْ مَّا الْعَقْبَةَ لَا  
 اور آپ کیا جانیں کہ گھائی کیا ہے،  
 وَكَرَّ رَتَبَةً لِّهٖ  
 وہ کسی کی گردن چھڑانا ہے۔

بہر حال قرآن نے انسان کو مجبور یوں سے نجات کی راہ دکھائی، اس کے لیے سہولتوں  
 کا اعلان کیا جن میں سے ایک حالت اضطرار اور حالت اختیار کا نمایاں فرق بھی ہے۔  
 خلافت فاروقی کے زمانے میں حجاز مقدس میں  
**سیدنا فاروق اعظم کا ارشاد** سخت قحط پڑا۔ اناج مفقود ہو گیا، اس حالت  
 میں حضرت عمر فاروق نے چور کے ہاتھ کاٹنے کی سزا پر عمل درآمد روک دیا۔ اور فرمایا جب تک  
 حکومت ہر شخص کو ضروریات زندگی مہیا نہیں کر سکتی، وہ قطع پید کی حد نامزد کرنے کا اختیار  
 نہیں رکھتی۔

سیدنا فاروق اعظم کے اس فرمان اور عمل سے قرآن و حدیث  
**سلطنت اسلامیہ کا فرض** کے بیان کردہ اصول کی پوری طرح وضاحت ہو جاتی ہے۔  
 اور یہ قرار پاتا ہے کہ سلطنت اسلامیہ کا فرض صرف حدود و تعزیرات کا نفاذ ہی نہیں بلکہ  
 اس کا اصل فرض بُرائی اور جرم کے مبادیات اور اسباب کا قلع قمع کرنا بھی ہے یعنی چوری  
 ڈکیتی اور دیگر بیماریوں کے اصلی محرکات کا کھوج لگانا اور پھر اس کو بیخ و بن سے  
 اکھاڑ پھینکنا اسلامی حکومت کا اولین فرض ہے۔

۱۔ البلد (۹۰: ۱۲-۱۳)

۲۔ کتاب الخراج، امام ابو یوسف، ص ۱۴ مطبوعہ قاہرہ ۱۳۰۲ھ۔

آج کے دور میں اسلامی حدود کو سخت بتایا جانا ہے، مگر یہ نہیں دیکھا جاتا کہ ان حدود کے عملی نفاذ سے پہلے مملکت اسلامیہ میں زندگی گزارنے کے بہتر حالات پیدا کرنے کی ضمانت ملتی ہے۔ اگر تمام ممکنہ سہولتوں کے باوجود کوئی شخص بدی کی طرف جھکتا ہے، تو وہ واقعی اس قابل ہے کہ اسے سخت سے سخت سزا دی جائے۔

سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے  
زمانے میں چوری کا ایک مقدمہ

سماعت کے لیے پیش ہوا۔ صورت حال یہ تھی کہ کچھ ملازموں کو اپنے سردار کے آؤٹ چرانے کے جرم میں مانوڈ کیا گیا تھا۔ جب مقدمہ چلا تو ان پر چوری پوری طرح ثابت ہو گئی۔ ابھی چوری کی سزا پر عمل درآمد نہ ہوا تھا کہ حضرت عمر فاروق کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ انہوں نے ان سرداروں کو بلا بھیجا جن کے پاس وہ لوگ ملازم تھے۔ وہ حاضر ہوئے تو فاروق اعظم نے ان سے پوچھا کہ تم نے کتنی مدت سے اپنے ان ملازمین کو تنخواہ نہیں مل رہی ہے۔ ان پر حضرت عمر فاروق نے فیصلہ دیا کہ ان سرداروں سے آؤٹوں کی دو گنا قیمت بطور تاوان وصول کی جائے۔

ان واقعات سے یہ بات اچھی طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ اسلام میں مجبوری اور حالت اختیار میں نمایاں طور پر فرق کیا گیا ہے۔

خداوند تعالیٰ نے لوگوں کو یہ تعلیم دی ہے کہ حرام بھی حالت اضطرار میں حلال ہو جاتا ہے اور اسے اپنے محبوب کے دین کے لیے بھی اکراہ دجبر کو ارا نہیں:

لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَدْ تَبَيَّنَ  
الرُّشْدُ مِنَ الْعُنَى ۗ

اور (مگر) اسے الگ ہو چکی ہے۔

۱۰ الموطا۔ امام مالک۔ جلد ۲۔ صفحہ ۴۸۔ مطبوعہ قاہرہ ۱۹۵۷ء

۱۱ البقرہ (۲: ۲۵۶)

خداوند تعالیٰ نے ہمیں ایسا دین دیا ہے جس میں کوئی چیز دوسری چیز سے القباس نہیں رکھتی۔ خیر کو شر سے اور شر کو خیر سے، نیکی کو بدی سے اور بدی کو نیکی سے نیز حالتِ اختیاری کو حالتِ اضطراری سے  
 بنا پر جب حج جیسے مقدس فریضے کا حکم نازل ہوا تو اس کے ساتھ بھی حالتِ مجبوری کا لحظہ رکھا گیا، ارشاد ہے:

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ  
 الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ  
 سَبِيْلًا  
 اور لوگوں پر خدا کا حق (یعنی فرض ہے) کہ جو اس گھر میں جانے کا مقدور رکھے، وہ اس کا حج کرے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب حج کا حکم نازل ہوا تو ایک صحابی نے سوال کیا:

اِنِّي مَحَلَّ غَايَمٍ يَا رَسُولَ اللّٰهِ۔

آپ خاموش رہے، اس نے سوال دہرایا مگر آپ ساخط رہے، اس نے تیری مرتبہ اپنے سوال کا اعادہ کیا پھر بھی آپ خاموش رہے۔ مگر جب سائل کا شوق سوال دیکھا تو فرمایا:

لَوْ قُلْتِ نَعَمْ لَوَجَبَتْ وَلَمَّا  
 اسْتَطَعْتُمْ ثُمَّ قَالَ ذَرُونِي مَا تَرَكْتُكُمْ  
 فَاِنَّمَا هَلِكُ مِنْ عَانَ قُبُلِكُمْ  
 بَصِيْرَةٌ سُوْا لِهٰمْ  
 اگر میں ہاں کہوں تو تم پر ہر سال حج فرض ہو جائے، جو ظاہر ہے تمہاری استطاعت سے باہر ہے۔ پھر فرمایا جہاں میں خاموش رہوں وہاں تم بھی خاموش رہو۔ کیونکہ تم میں سے پہلی آیتیں کثرتِ سوال سے ہلاک ہوئی ہیں۔

۱۔ آل عمران (۹۷:۳)

۲۔ بخاری و مسلم، کتاب الحج، مشکوٰۃ شریف، کتاب الحج، ۵۵۲:۱، حدیث ۲۲۶۱۔



خلاصہ کلام یہ کہ اسلام دینِ فطرت ہے۔ یہ انسانوں کو آسانیاں اور سہولتیں دینے کے لیے ہے، یہ انسانیت کو تمام بندھنوں اور زنجیروں سے نجات دلانے آیا ہے۔ یہ دین انسان کے جسم سے جبر و اکراہ کا بوجھ اتارتا ہے، اختیار اور اضطرار میں فرق کرتا ہے۔ اپنے مزاج کے اعتبار سے سراسر رحمت و رأفت اور شفقت و احسان ہے۔ اس سے یہ توقع بھلا کیے ہو سکتی ہے کہ وہ انسان کو اس کے عمل اور اس کے ہر فعل میں مقید قرار دے گا۔

”اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے اختیارات امورِ خیر میں صرف کرنے کی توفیق بخشے۔“  
(آمین)

تفاوت

کا  
انسانی زندگی میں کردار





انسان کے مجبور یا مختار ہونے اور اپنے اعمال کے کاسب ہونے کے مسائل پر بحث مکمل کر لینے کے بعد یہ دیکھنا چاہیے کہ اصل میں مسئلہ تقدیر کیا ہے؟ اور قضا و قدر میں باہمی فرق کیا ہے؟

### الف) قدر کا مفہوم

”قدر“ کا لغوی مفہوم اندازہ کرنا، وزن کرنا، طے کرنا اور مقررہ کرنا ہے، چنانچہ اس سلسلے میں ارشاد باری ہے:

اور ہر چیز کو ہم نے کتاب روشن  
یعنی لوح محفوظ میں لکھ رکھا ہے۔

وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ  
فِي إِمَامٍ مُّبِينٍ ۝

دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

یہ کتاب ہزل و بطلان نہیں بلکہ یہ  
قرآن عظیم الشان ہے، لوح محفوظ میں لکھا گیا۔

بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَّجِيدٌ ۝  
فِي لَوْحٍ مَّحْفُوظٍ ۝

۱۱۲۱۳۶) یٰسین (۱۳۶)

۱۱۲۱۸۵) البروج (۸۵)

نیز فرمایا:

يَمْحُو اللَّهُ مَا يَشَاءُ  
وَيُثَبِّتُ وَعِثَّةٌ أُمُّ الْكِتَابِ  
خدا جس کو چاہتا ہے، مٹا دیتا ہے  
اور جس کو چاہتا ہے، قائم رکھتا ہے  
اور اسی کے پاس اصل کتاب ہے۔

ان تمام آیات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ کائنات بشمول بنی نوع انسان کے احوال و کوائف کا علم خدا تعالیٰ کے پاس ازل سے موجود ہے جسے اس نے "ام الكتاب" یا "لوح محفوظ" میں حفاظت سے لکھا ہوا ہے۔ اور "کل شی" کا مفہوم یہ ہے کہ کائنات کا کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ ذرہ بھی اس کلیے سے ماوراء نہیں۔ بہت سی احادیث میں بھی اس مسئلے پر روشنی ڈالی گئی ہے مسلم شریف میں حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

كتب الله المقادير  
الخلايق قبل ان يخلق  
السموات والارض بخمسين  
الف سنة قال وكان  
عرشه على الماء  
اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان پیدا کرنے  
سے پہلے ہزار سال قبل مخلوقات کی تقدیر  
لکھ دی تھیں، جبکہ اس کا عرش پانی  
پر تھا۔

۱۳۱۱۳ (۳۹۱۱۳)

لوح محفوظ یا ام الكتاب سے مراد خداوند تعالیٰ کا وہ علم ہے جس میں سب چیزوں  
کے احوال موجود ہیں۔

۱۴ مسلم شریف، کتاب الایمان، مشکوٰۃ، کتاب الایمان، ۱: ۳۳، حدیث ۷۲۔

ایک دوسری روایت میں ہے:

ان اول ما خلق اللہ  
القلم فقال له اكتب  
فقال ما اكتب؟ فان  
اكتب الفتد فكتب ما  
كان وما هو كائن الى  
الابد له

سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے  
قلم کو تخلیق فرمایا اور اسے حکم دیا  
کہ لکھ۔ اس نے عرض کیا کہ کیا لکھوں؟  
فرمایا: مخلوقات کی تقدیریں لکھو۔ چنانچہ  
اس نے جو چیز ہو چکی تھی اور جو چیز  
ہونے والی تھی، سب لکھ دیں۔

اسی طرح ایک موقع پر بعض صحابہ نے آپ سے بوجہ

ترک لذات کی اجازت مانگی تو آپ نے فرمایا:

جَهَتْ الْقَلَمُ يَمَّا أَنْتَ  
لَا قِيْلَ لَه

تجھے جو کچھ ملنا ہے، اسے قلم لکھ کر  
خشک ہو چکا ہے۔

اس موضوع پر بے شمار احادیث اور روایات مروی ہیں، جن سے  
مسئلہ تقدیر کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ روایات مختلف  
محدثین نے ثقہ راویوں سے نقل کی ہیں۔ لہذا ان روایات کے مستند ہونے  
میں کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا۔

عوامی غلط فہمی اور اس کا ازالہ

سب سے پہلی یہ ہے کہ اس قسم کی آیات اور احادیث کا جو مفہوم عوام میں

۱۷۔ الترمذی، مشکوٰۃ شریف، ۳۷۱۱، حدیث ۸۷۔

۱۸۔ البخاری، کتاب النکاح، مشکوٰۃ، ۳۵۱۱، حدیث ۸۱۔

لیا جاتا ہے، وہ قرآن و حدیث کی مراد کے قطعاً منافی بلکہ متضاد ہوتا ہے۔ عوام کے بعض حلقوں نے ان آثار و روایات سے یہ تاثر لیا ہے کہ مسئلہ تقدیر کا مفہوم نوشتہ تقدیر کے سامنے تمام مخلوق بالخصوص انسانوں کی بے بسی اور مکمل مجبوری ہے۔ عوام کے خیال میں مسئلہ تقدیر کے ذریعے خدا تعالیٰ نے اپنے بندوں کو مجبور اور مقید کر دیا ہے، وہ اس سے سرموبھی انحراف نہیں کر سکتے۔

## (ب) قضا اور قدر کی دو اصطلاحیں اور ان کا مفہوم

ان دو مختلف اسلامی اصطلاحات میں غلط محبت کے نتیجے کے طور پر عوام الناس اس مسئلے میں غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اگر ان دونوں اصطلاحوں کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو بڑی حد تک اس غلط فہمی کا ازالہ ہو سکتا ہے۔ قضا و قدر کے دو مفہوم ہیں، ان میں سے ایک آفاقی اور کائناتی سطح کے اعتبار سے اور دوسرا انسان کے شخصی و انفرادی احوال کے لحاظ سے ہے۔

آفاقی اور کائناتی اعتبار سے قضا و قدر کا مفہوم یہ ہے کہ

قضا و قدر آفاقی و کائناتی اعتبار سے

قضا کا مفہوم تخلیق اور قدر کا مفہوم اختیار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ساتوں آسمانوں، زمین اور کائنات کے ساتوں طبقات پیدا کیے اور ان میں موجود لطیف و کثیف مخلوق کی تخلیق فرمائی، یہ خداوند تعالیٰ کی قضا ہے، اسی بنا پر سورہ حم السجدہ میں ارشاد فرمایا گیا:

پھر دو دن میں سات آسمان بنائے

فَقَضَاهُنَّ سَبْعَ

اور ہر آسمان میں اس (کے) کام،

سَمَوَاتٍ فِي يَوْمَيْنِ

کا حکم بھیجا۔

وَأَوْحَىٰ فِي كُلِّ سَمَاءٍ



## آمَرَ هَا

یہاں قضا کا لفظ خلق یعنی پیدائش کے معنوں میں مستعمل ہوا ہے جبکہ قدر قدرت اور تقدیر و قدیر کے الفاظ جو قرآن حکیم میں کثرت سے استعمال کیے گئے ہیں ان کا مفہوم "اختیار" و "اختبار" (چننا) ہے۔ اس طرح "قضا و قدر" کے دو لفظوں میں تخلیق کائنات اور اس کی بقا و سالمیت کا راز پنہاں ہے۔ ان دو الفاظ میں قانون تخلیق کی وہ بنیادی شق بیان کی گئی ہے جس کی بنیاد پر قدرت کا یہ عظیم اور پرہیزگار خانہ تخلیق کیا گیا اور اس کے ایک ایک ذرے کو ادراک و شعور بخشا گیا ہے۔

انسان کی انفرادی اور شخصی سطح پر قدر کے  
 معنی اندازہ اور قضا کے معنی اجراء کے

انسانی زندگی میں قدر کا مفہوم

ہیں (مفردات راغب الاصفہانی)

خداوند تعالیٰ نے اس دنیا میں انسان کے لیے اچھائی اور برائی تخلیق کر کے اسے اس میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے اور اپنے عمل کے لیے مخصوص کر لینے کا اختیار یعنی قدرت عطا فرمائی ہے۔ وہ چاہے تو نیکی کو اختیار کرے اور چاہے تو بدی کو اپنا و طیرہ بنالے۔ چنانچہ سورۃ البلد میں ہے :

بھلا ہم نے اس کو دوا نکھیں نہیں  
 دین، اور زبان اور دوہونٹ (نہیں دیے)  
 (یہ چیزیں بھی دیں، اور اس کو دخیرو شر)  
 کے دونوں راستے بھی دکھا دیے۔

أَلَمْ نَجْعَلْ لَهُ عَيْنَيْنِ ۝  
 وَلِسَانًا وَشَفَتَيْنِ وَهَدَيْنَاهُ  
 النَّجْدَيْنِ ۝

لہ اُمّ السجدہ (۱۲۱:۴۱)

لہ البلد (۱۰:۹۰ تا ۱۰)

بالفاظِ دیگر خداوند تعالیٰ نے انسان کو جس قدر ظاہری اور باطنی صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں، ان سب کا ایک واضح مقصد یہ ہے کہ اگر وہ چاہے تو اپنی صلاحیتوں کو راہِ خیر میں صرف کر کے مراتبِ کمال سے ہمکنار ہو جائے اور چاہے تو اپنی ان قوتوں کو بدی کے ذریعے بولنے اور کانٹنے کے لیے وقف کر دے۔ خدا تعالیٰ نے

ایک دوسرے مقام پر فرمایا:

لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ  
فَتَلْتَبِينَ الرُّشْدَ مِنَ  
الْغَيْبِ لَهُ

دینِ اسلام میں زبردستی نہیں ہے،  
ہدایتِ صاف طور پر ظاہر اور گمراہی سے  
الگ ہو چکی ہے۔

بیز فرمایا:

اور کہہ دو، یہ قرآن تمہارے پروردگار  
کی طرف سے برحق ہے۔ جو چاہے ایمان  
لائے اور جو چاہے کافر رہے۔

وَقَدْ اَلْحَقْنَا مِنْ رَبِّكُمْ  
فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ  
شَاءَ فَلْيُكْفُرْ لَهُ

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے اصول کی تبلیغ کی وضاحت  
کرنے کی تلقین کرتے ہوئے ارشاد ہوا،

پیغمبر کے ذمے تو خدا کا پیغام پہنچا  
دینا ہے۔

مَا عَلَي الرُّسُولِ  
اِنَّ الْبَلَاغَ لَهُ

انبیاءِ کرام علیہ السلام بھی اپنی قوموں کو تذکیر و مواعظت کے بعد فرماتے تھے،

۱ البقرہ (۲: ۲۵۶)

۲ الکہف (۱۸: ۲۹)

۳ المائدہ (۵: ۹۹)

وَمَا عَلَيْكَ إِلَّا الْبَلَّغُ  
 اور ہمارے ذمے تو صاف صاف  
 پہنچا دینا ہے اور بس۔

مقصد یہ تھا کہ پیغمبروں کا کام ایصال الی المطلوب نہیں، بلکہ محض  
 خدا کے پیغام کا پہنچانا تھا۔ خدائی حکم کے پہنچ جانے کے بعد اب یہ کام متعلقہ فرد  
 کا ہے کہ وہ چاہے تو انبیاء کی باتوں پر کان دھرے اور چاہے تو اپنے کانوں میں  
 روٹی ٹھونس لے۔ اسی بنا پر سورہ کافرون میں انعامِ حجت کرتے ہوئے فرمایا:  
 لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ لَهٗ  
 تم اپنے دین پر میں اپنے دین پر۔

### قضا کا مفہوم

”قدرت کے مفہوم کی وضاحت ہو چکی۔ قضا سے مراد وہ اصول اور وہ قوانین فطرت  
 ہیں جن کے تحت یہ کارخانہ قدرت اپنے اپنے وقت پر، اپنے مخصوص خصائص و  
 مصالح کے ساتھ معرض تخلیق میں لایا گیا ہے اور جن کے تحت اس کائنات کے  
 نظام کی بقا و علت و معلول، سبب اور مسبب نیز عمل اور رد عمل کے نظام کے تحت  
 منضبط کر دیا گیا ہے۔ اگر کوئی شخص نیکی کرے گا تو اس کے نتائج بھی نیک نکلیں گے  
 اور برائی کے ثمرات بھی ویسے ہی برے ہوں گے۔ انسان جو کچھ کرے گا، اس کا بدلہ  
 پائے گا۔ جس مقصد کے لیے تنگ و دو اور جد و جہد کرے گا اس کے حصول میں کامیاب  
 کامران ہوگا۔ اس تمام نظام قدرت کا نام قضا ہے الہی ہے۔ اس کا ذکر سورہ البقرہ  
 میں یوں کیا گیا ہے:

۱۱۰۳۶) یٰۤاٰیُّهَا الَّذِیْنَ

۱۱۰۹) الْكَافِرُونَ

ان الذین کفروا  
سواء علیہم اذرتہم  
ام کم تذرہم لایؤمنون  
جو لوگ کافر ہیں، انہیں تم نصیحت  
کر دیا نہ کرو، ان کے لیے برابر ہے، وہ  
ایمان نہیں لائیں گے۔

بالفاظ دیگر جس شخص نے ہدایت کے آفتاب عالمتاب کی تمام تر جگہ گاہوں  
کے باوجود کفر کے اندھیرے اور پرخطر راستے ہی کو اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا، اس  
کے ہدایت سے محروم رہنے کا فیصلہ قدرت کی طرف سے صادر کر دیا جاتا ہے۔ یعنی  
ہدایت سے محروم رہنا خود اس کے اپنے فعل کا نتیجہ ہے۔  
ایک دوسرے مقام پر ایسے لوگوں کی قلبی حالت کی ترجمانی کرتے ہوئے  
ارشاد ہوا،

کَلَّا تَبْلُرَانَّ عَلٰی  
فُلُوْبِهِمْ مَا كَانُوْا  
يَكْسِبُوْنَ ۝۲  
دیکھو یہ جو اعمال بد کرتے ہیں،  
ان کے دلوں پر زنگ بیٹھ گیا ہے۔

### سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد

اس مقام ضلالت کی حقیقت بیان کرتے ہوئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ  
وسلم نے ارشاد فرمایا کہ،  
”جب کوئی شخص نیک کام کرتا ہے تو اس کے دل پر نور کا ایک نکتہ ثبت  
ہو جاتا ہے اور اگر وہ نیکیاں کرتا چلا جائے تو اس کا دل بقعہ نور بن جاتا ہے۔ پھر

۱۔ البقرہ (۶۰۲)

۲۔ المطففین (۱۲۱، ۸۳)

اس کی نیکی کا اثر اس کے چہرے پر بھی ظاہر ہونے لگتا ہے۔ اس کے برعکس اگر کوئی شخص برائی کرتا ہے اور اس پر خدا کے سامنے توبہ نہیں کرتا تو اس کے دل پر ایک سیاہ نکتہ لگا دیا جاتا ہے۔ اب اگر وہ شخص توبہ کر لے تو وہ نکتہ محو ہو جاتا ہے۔ توبہ نہ کرے بلکہ دوسرا گناہ کر لے۔ پھر تیسرا اور اسی طرح گناہ پر گناہ کرتا چلا جائے تو ہر گناہ کے بدے اس کے دل پر ایک ایک نکتہ بڑھا دیا جاتا ہے۔ یہ سلسلہ جاری رہتا ہے تا وقتیکہ اس کے دل کی دنیا سیاہ بادلوں کی طرح ظلمت کدہ بن کر رہ جاتی ہے اور اس میں قبولِ حق کی کوئی صلاحیت باقی نہیں رہتی۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ یہی وہ ران (زنک) ہے جس کا سورۃ المطففین میں یوں ذکر کیا گیا ہے: **كَذٰلِكَ**  
**بَلَّوْا نَاصِيَاتَ ظُهُورِهِمْ كِذَّبَتْ اَبْوَابُ السَّمَاءِ**

یہاں پہنچ کر بندے میں قبولِ حق کا جذبہ مکمل طور پر مٹ جاتا ہے اور وہ مجسمہ شیطنت اور سرچشمہ شر بن جاتا ہے۔

یہاں یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ ان کے دل کا تاریک کر دیا جانا نیز ان کے قلوب و اذہان پر مہر خد اوندی کا ثبت ہو جانا ان پر کوئی ظلم ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ خود ان کے اعمال و کسب کا نتیجہ اور ثمرہ ہے نیز ان کے اپنے افعالِ شنیعہ کا ردِ عمل ہے۔ انہوں نے جو کچھ چاہا تھا، اس کا انجام انہیں دکھا دیا گیا۔

## حق کی پکار جاری رہتی ہے

(اصولِ قضا کے تحت) یہ سب کچھ ہوتا اور بار بار دہرایا جاتا ہے، مگر قانونِ قدر کے تحت نافرمان بندوں کو قبولِ حق کے اختیار کے ساتھ ساتھ خدا تعالیٰ کی طرف

۱۔ ابن جریر الطبری۔ جامع القرآن فی تفسیر القرآن مطبوعہ قاہرہ ۱۰۶۱ھ، تفسیر سورۃ البقرہ آیت ۶-۷۔

سے حق کی دعوت کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ ان کے کانوں اور آنکھوں کے بند دریچوں کو کھولنے اور ان کے مسخ شدہ قلوب و اذہان کو مائل بہ حق کرنے کی کوشش جاری رکھی جاتی ہے۔ مزید برآں ان پر توبہ و استغفار کے دروازے بھی کھلے رکھے جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ حکم قدر کے تحت ہمیشہ سے جاری رہا ہے اور جاری رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ سرور کائنات سلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ”عَاذُكُمْ مِّنْ اَمِّكُمْ تَنْذِرُكُمْ“ کا حکم نازل ہونے اور کفار و معاندین کے قلوب کے مسخ شدہ ہونے کی خبر زبان رسالت سے نشر کیے جانے کے باوجود بھی پیغمبر اسلام کی طرف سے ان کو ہرگز توبہ کی تبلیغ جاری رہی اور ان کی ہلاکت سے پہلے کسی موقع پر بھی یہ فیصلہ نہیں کر لیا گیا کہ اب پیغمبر ہدایت کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

## بیمار شخص کے لیے مرغن خوراک

عملی زندگی میں اس کی مثال اس طرح بھی جاسکتی ہے کہ کوئی شخص بے احتیاطی کر کے اور خراب اور ناقص غذاؤں کھا کر اپنا معدہ مکمل طور پر خراب کرے۔ جب جسمانی کمزوری اور ضعف حد سے بڑھنے لگے تو اپنی بیماری کا صحیح طریقے سے علاج کرنے کے بجائے از خود مرغن اور قوت بخش غذاؤں کا استعمال شروع کر دے تو نتیجہ کیا ہوگا؟ ظاہر ہے کہ ایسی طاقت ور غذاؤں اس شخص کو مزید بیمار اور مضحک کر دیں گی۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ خوراک میں کچھ کمی ہے، بلکہ اصل بات یہ ہے کہ اس کے معدے میں اسے قبول کرنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہی۔ اب اگر مذکورہ شخص یہ شکایت کرنے بیٹھ جائے کہ لوگ یہی غذاؤں کھاتے ہیں اور طاقت ور ہو جاتے ہیں اور میں روز بروز مزید کمزور ہوتا جا رہا ہوں تو ایسے شخص کو ہمیشہ ایک ہی جواب ملے گا کہ اس میں کسی دوسرے کا قصور ہے، نہ غذا کا۔ یہ تو صرف اور صرف اسکا

اپنا قصور ہے کہ اس نے پیسے اپنا معدہ خراب کیا، پھر اسی کیفیت میں مرغن غذا نہیں کھانی شروع کر دیں۔

اسی طرح ایک شخص بڑائی کی زندگی اختیار کرتا ہے۔ پھر اس راستے پر بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ اب اگر قلب کے متعفن اور مردہ ہو جانے کی وجہ سے اس میں قبولِ حق کی صلاحیت نہیں رہی اور اس پر کوئی اعلیٰ سے اعلیٰ نصیحت بھی کارگر نہیں ہوتی تو اس میں کسی دوسرے کا کوئی قصور نہیں اور نہ ہی اس سوچ کا کوئی جواز ہے کہ "میرا مقدر ہی خراب تھا" اسے چاہیے کہ وہ پہلے اپنے باطن کی اصلاح کرے۔ جہاں سے اصل بگاڑ اور فساد شروع ہوا ہے۔ جس بگاڑ کے ہوتے ہوتے اس پر تمام وعظ و نصیحت بے اثر ہو جاتی ہے اور پھر وعظ و نصیحت کی طرف دھیان دے۔

## قدرِ مقدم — قضا مؤخر

بہر حال انفرادی اور شخصی سطح پر قضا و قدر کا مفہوم کچھ یوں ہے کہ یہ دونوں باہم لازم و ملزوم ہیں۔ ان میں سے اول الذکر یعنی قدر کا تعلق بندے کے اختیار اور فعل سے ہے جبکہ مؤخر الذکر یعنی قضا کا تعلق خداوند تعالیٰ کے حکم کے نفاذ سے ہے۔ ان میں ترتیب یہ ہے کہ قدر ہمیشہ مقدم اور قضا ہمیشہ مؤخر ہوتی ہے۔

لفظی اعتبار سے قدر کا مفہوم اندازہ کرنا، کسی چیز کو ماپنا، تولنا ہے۔ انگریزی میں اس کا مفہوم (EVALUATION) (ASSESSMENT) وغیرہ ہے جو علم اس انداز کی بنا پر واقع ہوا سے بھی قدر کہتے ہیں۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ

ہم نے ہر چیز اندازہ مقررہ کے ساتھ



## بِقَدْرِ لَه

پیدا کی ہے۔

اُردو میں ”قدر“ کا لفظ اندازے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً ہم یہ کہتے ہیں کہ ”یہ چیز اس قدر کافی ہے“ یا ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ بات ”اس قدر درست ہے“ اور اس قدر غلط“ پس قدر سے مراد اُردو میں ایک خاص اندازہ اور مقررہ ہوتی ہے جبکہ قضا کا مفہوم اظہار اور بیان ہے۔

قدرت نے اپنے عالم الغیب والشہادہ ہونے کی بنا پر تخلیق کائنات سے پہلے اپنے بندوں کو اختیارات اور آزادی دینے کا جو فیصلہ کیا تھا، اس کا نام قدر ہے اور اس اندازے پر بہتی علم کے اظہار کا نام قضا ہے جیسے کوئی انتہائی قابل اور تجربہ کار اُستاد اپنے شاگردوں میں سے کسی ایک کے متعلق کہہ دے کہ فلاں طالب علم ضرور فیل ہوگا۔ اور ایک سال کے بعد وہ طالب علم فیل ہو جائے۔ تو کیا اُستاد کا ایک سال پہلے اس کے فیل ہونے کی پیشینگوئی کرنا اس کے فیل ہونے کا باعث ہوایا اس کا اپنا عمل۔ ظاہر ہے کہ اُستاد کا اعلان بچے کے مستقبل (FUTURE) کو متاثر نہیں کر سکتا۔ اُستاد کے اس قول نے نہ کورہ طالب علم کے فیل ہونے میں کوئی کردار ادا نہیں کیا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ وہ محض اور محض اپنی نالائقی اور بے توجہی کی وجہ سے فیل ہوا ہے۔ اگر وہ محنت کرتا تو اسے یہ روز بد دیکھنا کبھی نصیب نہ ہوتا۔ البتہ اُستاد کا ایک سال قبل بتا دینا اس کے کمال علمی اور مہارت نامہ کی دلیل ہے۔

## موسمی حالات کی پیشین گوئی

اسی طرح محکمہ موسمیات کی طرف سے روزانہ موسمی حالات کی پیشینگوئی کی جاتی

لہ القدر (۲۹۰۵۴)

ہے جس میں کسی علاقے میں بارش کا ہونا اور کسی علاقے میں بارش کا نہ ہونا بھی شامل ہوتا ہے۔ اب اگر پیشینگوئی کے بعد اگلے روز بارش ہو جاتی ہے یا موسم خشک رہتا ہے تو ساری دنیا جانتی ہے کہ ز بارش برسانے میں محکمہ موسمیات کو دخل ہے، نہ موسم کی خشکی میں۔ یہ تو محض حالات سابقہ کے مختلف مخصوص نشانات اور علامات کی بنیاد پر مفوضہ معلومات کا اظہار تھا۔ بارش کا ہونا یا نہ ہونا تو نظام قدرت کا ایک حصہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر یہ پیشینگوئیاں غلط بھی ثابت ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح ماہرینِ فلکیات چاند یا سورج کے گرہن کی پیشینگوئی کرتے ہیں اور اس کے مطابق چاند اور سورج کو گرہن لگ بھی جاتا ہے۔ لیکن یہ گرہن اس پیشینگوئی کی وجہ سے تو نہیں لگتا۔

## پیشینگوئیوں کا پس منظر

یہاں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ آخر لوگوں کو وقت سے پہلے آنے والے حوادث و واقعات کا پتا کیوں نہ کر چل جاتا ہے؟ وہ کیسے یہ معلوم کر لیتے ہیں کہ یہ واقعات رونما ہونے والے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ اس کائنات کا ہر وجود ایک معین و مقرر سمت کی جانب مجبور سفر ہے۔ اس کے سفر کے دوران میں پیش آنے والے ہر واقعے کی کوئی نہ کوئی علت اور غایت ضرور ہوتی ہے۔ خالق کائنات نے ہر علت کے ساتھ معلول اور ہر سبب کے ساتھ مسبب کو مشروط و ملزوم کر دیا ہے۔ تو جو لوگ اس کائنات کے کسی حصے یا کسی نظام کے علت و معلول یا سبب اور مسبب کو جان جانتے ہیں، ان کے لیے واقعات کی رفتار کا رخ متعین کرنا اور ان کے وقوع کی ٹھیک ٹھیک گھڑیوں کا جان لینا دشوار نہیں رہتا۔ اس نوع کی تمام پیشینگوئیاں اسی زمرے میں آتی ہیں۔ یہ لوگ واقعات

کے خارجی وقوع سے پہلے محض علت یا سبب کو جان کر اس کے معلول یا  
سبب کا کھوج نکال لیتے ہیں۔

اس تفصیل سے یہ بات بخوبی ظاہر ہو جاتی ہے کہ ماہرین فلکیات ہوں یا  
ماہرین موسمیات، وہ اپنی پیشینگوئی کے ذریعے نظام کائنات کی سمت اور جہت  
تبدیل نہیں کرتے اور ایسا کر بھی نہیں سکتے۔ یہ جہت اور سمت تو خلاق عالم نے ان  
کو ابتداء آفرینش سے عطا کر رکھی ہے۔ یہ لوگ تو فقط علامات کو جان کر آنے والی ایک  
لٹے شدہ حقیقت کا اظہار کرتے ہیں۔ اور بس۔

زمانہ کے تین روپ ہیں، ماضی، حال، مستقبل۔ ماضی تو ہم پر عیاں ہے کہ اس  
کے تمام واقعات لوح دہر پر مرقوم ہو کر سب کی نگاہوں میں آچکے۔ ایک طرف سے  
حال بھی ہمارے علم اور ادراک کے دائرے میں ہے۔ البتہ مستقبل (FUTURE)  
زمانے کا وہ حصہ ہے جو مکمل طور پر ہماری نگاہوں سے اوجھل اور مخفی ہے۔ اس  
کی ایک ایک کڑی پر دہ غیب میں مستور ہے۔ اسی بنا پر سورہ لقمان میں خمس مغیبات  
(پانچ خفیہ امور) میں سے ایک امر یہ بھی ہے:

وَمَا تَدْرِي مَاذَا

اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کل

کیا کام کرے گا۔

تَكْسِبُ عِنْدًا لَهُ

لیکن مستقبل ہر ایک کے لیے مخفی نہیں ہے۔ کوئی آنکھ ایسی بھی ہے جس کے سامنے  
مستقبل کا ہر واقعہ اپنی تمام جزئیات سمیت روز روشن کی طرح ظاہر و بین ہے۔  
یہ ہستی خود ذات جل و علا کی ہے جس کے سامنے کائنات کا ماضی، حال اور مستقبل  
کھل کتاب کی طرح روشن ہیں۔ اپنے وسیع علم اور غیر محدود ادراک کی بنیاد پر وہ یہ

جانتا ہے کہ آئندہ زمانے میں کیا ہوگا اور کیا نہیں ہوگا۔ اس کی قدرتیں اور قوتوں کی طرح اس کا علم بھی پہلے پایا ہے۔ لیکن جس طرح کسی واقعے کا علم اس کے وقوع کی مجبوری اور قید نہیں بن سکتا، اسی طرح یہ بے پایاں خدائی علم کسی انسان کی مجبوری نہیں ہو سکتا۔

مولانا روم نے اس موضوع پر دو بڑی نفیس حکایات پیش کی ہیں۔ آپ فرماتے ہیں ہیں کہ ایک مرتبہ ایک چور کوٹ ہی پیادے پکڑ کر کوٹوال کے پاس لائے اور بتایا کہ اس شخص کو ہم نے چور کا کتے ہوئے موقع پر گرفتار کیا ہے۔ کوٹوال نے چور سے پوچھا تو نے چوری کی ہے؟ اس نے جواب دیا ہاں، لیکن میں نے جو کچھ کیا خدا کے حکم سے کیا۔ تو جانتا ہے کہ کائنات کا ایک ذرہ بھی خدا کے حکم سے باہر نہیں ہے۔ یہ سن کر کوٹوال نے پیادوں سے کہا کہ اسے درخت سے اٹا لٹکا کر اتنا مارو کہ کھلیا پیاس بھول جائے۔ یہ حکم سن کر چور نے گڑ گڑانا اور ردنا شروع کر دیا تو کوٹوال نے کہا: اب کیوں ردلتے؟ یہ کام میں بھی خدا کے حکم ہی سے کر رہا ہوں۔

اسی طرح ایک شخص بغیر کسی اجازت کے باغ میں جاگسا اور درخت پر چڑھ کر پھل توڑنے لگا۔ اتنے میں باغ کا مالک ادھر آنکا اور اس شخص کو پھل توڑتے دیکھ کر بولا۔ ارے ادبے جی! یہ کیا حرکت ہے؟ پھل توڑنے والے نے جواب دیا اگر اللہ کے باغ سے اللہ کا بندہ اللہ کی پیدا کی ہوئی کھجور توڑ کر کھائے تو اس میں بے حیائی کی کون سی بات ہے؟ خدا کے بے نیازان لانا۔ ان نعمتوں پر سانپ بن کر بیٹھنے والا تو کون ہے؟ یہ سن کر باغ کے مالک نے اپنے نوکر سے کہا: ذرا مضبوط سی رسی اور کوڑا لے آؤ تاکہ میں اللہ کے اس بندے

خدا تعالیٰ نے اپنی نسبت ارشاد فرمایا:

وَعِندَهُ مَفَاتِحُ

الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ

اور اسی کے پاس غیب کی کنجیاں  
ہیں جن کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

”مفاتح الغیب“ کہتے ہیں مخفی حقائق کو۔ مطلب یہ ہے کہ کائنات کے حقائق مخفی غیبیہ کا علم خدا کے پاس ہے۔ خدا تعالیٰ کی ذات آفرینش کائنات سے پہلے موجود تھی۔ اس نے انسانوں اور دوسری کائنات کو پیدا کیا اور پھر انسانوں کو اپنے عمل کا مکمل اختیار عطا فرما دیا: انسانوں نے اپنے اس اختیار کو بروئے کار لاتے ہوئے مختلف اچھے اور بُرے کام کیے۔ کسی نے قتل کیا، کسی نے لوٹ مار مچائی، کسی نے بھلائی کی، کسی نے عدل و انصاف کے تقاضے پورے کیے۔ لڑائیاں لڑیں، ملک فتح کیے، زمین کو سنوارا، شہر آباد کیے، چھوٹی بڑی بستیاں آباد کیں۔ ان اعمال کے وقوع پذیر ہونے سے مختلف نتائج پیدا ہوئے۔ خداوند تعالیٰ چونکہ مفاتح الغیب کا مالک ہے، اس لیے انسانوں کو متوقع آزادی دیے جانے کے جو نتائج وقوع پذیر ہونے تھے، وہ اسے پہلے سے معلوم

(بقیہ از صفحہ گزشتہ)

کو جواب دوں۔ غلام دوڑا دوڑا گیا اور دونوں چیزیں پیش کر دیں۔ باغ کے مالک نے چور کو اسی درخت سے باندھا اور اس کی پیٹھ پر کوڑے برسائے شروع کر دیے۔ چور نے کہا: ارے بھائی کچھ تو خدا کا خوف کرو کیلئے مجھے مار ڈالے گا۔ اس نے جواب دیا: بیخیز مت! اللہ کی پدائیک ہونی لکھی ہے اللہ کا ایک بندہ اللہ کے دوسرے بندے کو مار رہا ہے۔ آخر اس چور نے اپنے عقیدے سے توبہ کی اور اقرار کیا کہ بے شک

انسان کو قوت اختیار یہ حاصل ہے (حکایات رومی، ص ۱۰۶-۱۰۷)

لے الانعام ۶۱: ۵۹

تھے۔ لیکن خداوند تعالیٰ کا یہ علم کسی شخص کو مجبور نہیں کرتا۔  
 فی الجملہ کسی امر کا پہلے سے جان لینا، اس کے وقوع کا اندازہ لگانا "قدر"  
 ہے اور تخلیق کائنات کا ایک حصہ ہے۔ جبکہ اس کے علم کے اظہار اور  
 اسے بیان کر دینے کا نام "قضا" ہے۔ "قدر" انسانی آزادی کی سب سے بڑی دلیل  
 ہے۔ کیونکہ اس سے انسان کے مختار اور آزاد ہونے پر روشنی پڑتی ہے، انسان اور  
 اس کے اعمال و کوائف سے متعلق خدا تعالیٰ کے مقرر کردہ اندازوں کا اظہار  
 ہوتا ہے

## قضا مُعَلَّقٌ اور قضا مُبْرَمٌ

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ جو خدا تعالیٰ نے انسان کے کسب و عمل کی نسبت  
 پہلے سے اندازہ مقرر فرمایا ہے اور "قضا" کی صورت میں اس کا اظہار بھی فرمادیا  
 ہے لیکن انسان کا تکیس کار کی آخری گھڑی تک اپنے اس کام کو کرنے یا نہ کرنے  
 کا اختیار باقی رہتا ہے وہ اگر چاہے تو اپنی نیت کو بدل سکتا ہے اپنے بڑھتے  
 ہوئے قدموں کو روک سکتا ہے اور خدا کی طرف سے بھی یہ وعدہ ہے کہ اگر کوئی  
 بندہ بدلنا چاہے تو ہم اس کے بدلنے والے ارادے اور نیت کے ساتھ ہی اس  
 کی تقدیر بھی بدل دیں گے۔ سورۃ الرعد میں ارشاد فرمایا:

يَمْحُو اللَّهُ مَا يَشَاءُ  
 وَيُنْبِتُ وَعِنْدَهُ أُمُّ الْكِتَابِ  
 خدا جس کو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور  
 (جس کو چاہتا ہے) قائم رکھتا ہے۔ اور  
 لوح محفوظ اسی کے قبضہ قدرت میں ہے۔

اہم کتاب سے مراد "لوح محفوظ" ہے۔ جہاں ماکان و مایکون کے احوال اور کیفیات کا اندراج ہوتا ہے جو بقول بعض عظیم الہی ہی کا نام ہے۔ لہذا اس آیت مبارکہ میں اعلان کیا گیا ہے کہ خداوند تعالیٰ اپنے انداز سے اس میں تبدیلی کرتا رہتا ہے اور موقع بہ موقع اس میں رد و بدل کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ یہ عام طور پر "قضا و محل" کی صورت میں ہوتا ہے۔ گویا اگر انسان خود کو بدل لے یا بدلنا چاہے تو خداوند تعالیٰ اس کی خاطر اپنے انداز سے اور اپنی مقرر کردہ تقدیر میں تبدیلی فرمادیتا ہے۔

معاذ اللہ خدا کا علم انسان کے اعمال کی نسبت غلط نہیں ہو سکتا۔ تو پھر لکھی ہوئی تقدیر کو مٹانے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ اور اگر تقدیر لکھی ہوئی نہ ہو تو اس کو لکھنا کیوں ضروری ہوا؟ بہر حال لکھی ہوئی کو مٹانا اور نہ لکھی ہوئی کا لکھا جانا، یہ دونوں امر اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ تقدیر قطعاً ایسے مسئلے کا نام نہیں جس میں تبدیلی نہ ہو سکے۔ وہ تو محض انسانی اچھائی یا برائی کا ایسا علم ہے جس میں موقع و محل کی نسبت سے تیزی و تبدل ہو سکتا ہے۔ بشریکہ انسان اس تبدیلی پر مائل ہو۔

### حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ملک شام میں طاعون کی وبا پھیلی اس زمانے میں حضرت عمر بھی شام گئے ہوئے تھے۔ وبا کی وجہ سے انہوں نے وہاں سے نکلنے میں جلدی کی تو حضرت ابو عبیدہ نے فرمایا:

اقر من قضاء اللہ کیا آپ اللہ کی قضا سے بھاگتے ہیں؟

فرمایا:

اقر من قضاء اللہ میں اللہ کی قضا سے اس کی قدر



الحق قدر اللہ لہ کی طرف بھاگتا ہوں

مطلب یہ ہے کہ قضا تو فیصلے کا صرف اعلان ہے۔ اگر طاعون جیسا مہلک مرض کسی علاقے میں وبا کی صورت میں پھیل جائے اور میں کسی دوسرے علاقے میں پہنچ کر اس مرض سے بچا جاؤں تو میرا پرخ جانا یقیناً خدا کی تقدیر یعنی علم میں ہوگا۔ اس لیے فرمایا کہ طاعون کے فیصلے سے ہٹ کر میں خدا کے علم کی طرف جا رہا ہوں۔ کیونکہ قضا ایک امر الہی ہے مگر تقدیر پر انسان کا اختیار ہے۔ ۱۰

### سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد

ایک مرتبہ صحابہ کے ذہنوں میں مسئلہ تقدیر کی نسبت کچھ شکوک و شبہات پیدا ہوئے۔ چنانچہ انہوں نے انہی سوالات کو ذہن میں رکھتے ہوئے اور خیال کرتے ہوئے کہ جو کچھ طے ہو چکا ہے وہ بدل نہیں سکتا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا:

کیا ہم اپنی تقدیر پر بھروسہ کر لیں۔

أَفَلَا تَتَوَكَّلُ

اس پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

جو کچھ تمہیں طے والا ہے اسے قلم لکھ

جفت القلم بما أنت

کر خشک ہو چکے ہیں۔

لاق ۳

۱۰ المفردات، الراغب الاصفہانی

۱۱ تفسیر المفاتیح العلوم للرازی، ۶، ۵۲۷، مطبوعہ قاہرہ بذیل الاحزاب (سورہ ۳۳،

آیت ۳، ۳۸) نے یہ الفاظ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف منسوب

(بقیہ اُندہ صفحے پر)

آپ کے اس ارشاد کا مفہوم یہ ہے کہ فدائی علم اور نوشتہ تقدیر نے انسان کو مجبور نہیں کر دیا بلکہ انسان کو تنگ و دو اور سعی و جدوجہد کے ساتھ اپنے مقدر کو تلاش کرنے کی آزادی دی ہے، اسے عمل کا اختیار دیا ہے، اسے کسب خیر کی تلقین فرمائی ہے۔

ابتداء خطبہ میں ایک حدیث کا تذکرہ کیا گیا تھا، جس میں ارشاد تھا کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے قلم کو پیدا فرمایا اور اسے حکم دیا کہ جو کچھ ہو چکا ہے (ماکان) اور جو کچھ ہونے والا ہے (ما یکون) سب کچھ لکھ دے۔ یہاں غور فرمائیے: صرف زمانہ مستقبل کے کو الٹ قلبند کرنے کا حکم نہیں دیا جا رہا، بلکہ ماضی کے واقعات بھی قلبند کرنے کا امر فرمایا۔ اب اگر یہ تقدیر ہی نوشتہ اپنے سے پہلے (ماکان) کے واقعات پر اثر انداز نہیں ہو سکتا تو مستقبل کے حالات (ما یکون) کو کیونکر متاثر کر سکتا ہے۔

اسی طرح ایک موقع پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام کو ایک طویل خطبہ دیا جس کے متعلق حضرت ابو حذیفہ فرمایا کرتے تھے:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک	تمام فیما رسول اللہ
مرتبہ لمبا خطبہ دیا جس میں آپ نے اپنے	صلی اللہ علیہ وسلم
وقت سے لے کر قیامت تک جو کچھ ہونے	مقام ما ترک شیئا

(بقیہ از صفحہ گزشتہ)

کیے ہیں اور یہ واقعہ لکھا ہے کہ آپ ایک پہاڑ پر سے گزر رہے تھے وہاں کچھ ایسے پتھر پڑے تھے جو گرنے کو تھے۔ آپ وہاں سے تیزی کے ساتھ گزر گئے۔ اس موقع پر مندرجہ بالا سوال و جواب ہوئے عین ممکن ہے یہ دونوں ہی واقعات پیش آئے ہوں حضرت عمرؓ کو ارشاد نبوی یاد ہوا اور انہوں نے اس موقع پر یہی الفاظ دہرائیے ہوں۔  
 ۱۰۰ ابغاری و مسلم

بیکون فی مقامہ ذالک  
 الی قیام الساعة الا  
 حدث به حفظہ من  
 حفظہ ونسیہ من  
 نسیہ لہ

والا تھا، سب کا ذکر کیا۔ جس نے یاد  
 رکھا، اس کو یاد رہ گیا اور جس نے بھلا  
 دیا، وہ بھول گیا۔

اس قسم کی بہت سی روایات اور احادیث کتب صحیح ستہ میں مروی ہیں، جن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے زمانہ مستقبل کی پیشینگوئیاں اور آئندہ زمانے کے واقعات و حالات کا ٹھیک ٹھیک بیان مذکور ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ آپ نے لوگوں کے جنت میں داخل ہونے تک کے تمام وقائع بیان فرما دیے تھے۔

آپ نے اس خطبہ میں قیامت تک کے احوال کو بیان فرمایا ازل میں قلم نے بھی کائنات کے جملہ حقائق کو لوح محفوظ پر رقم کیا تھا۔ اگر حضور اکرم کا بیان انسانی زندگی کے لیے جبر نہیں ہے تو نوشتہ نقتہ یر انسان کو کیسے مجبور کر سکتا ہے۔ خدا تعالیٰ نے انسان کی نیکی اور بدی کی ذمہ داری خود اس کے اپنے کتہہ عمل پر ڈالی ہے تاکہ نیکی کی سورت میں جزا کا اور بدی کی سورت میں سزا کا مستحق ہو سکے۔ اسی مضمون کو علامہ اقبال نے کس خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے، فرماتے ہیں:

ترے دریا میں طوفان کیوں نہیں ہے  
 خودی تیری مسلمان کیوں نہیں ہے  
 عبت ہے شکوہ نقتہ یریز داں  
 تو خود نقتہ یریز داں کیوں نہیں ہے

۱۰ بخاری و سلم۔ نیز مشکوٰۃ شریف، ۱: ۳، حدیث ۵۱۴۴۔

خودی کو کہ بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے  
خدا بندے سے خود پوچھے، بقا تیری رضا کیا ہے

گویا بندے کے لیے خدا کی طرف سے اعلان ہے کہ،

اے انسان! تو اس کائنات میں تصرف کرنے والی واحد مخلوق تھا، کائنات  
کا ایک ایک ذرہ ہم نے تیری غلامی میں دیا تھا تو اگر میری اطاعت اختیار کیے رہتا  
تو کائنات کا ہر وجود میرے سامنے سرنگوں اور سر بسجود رہتا۔ اے انسان! تو  
اس کائنات میں خدا تعالیٰ کی محبت اور اطاعت کے ذریعے اس کا مقبول بندہ  
بننے آیا تھا۔ لیکن تجھے کس نے گمراہ کر دیا۔ تو نے یہ کیسے فرض کر لیا کہ میرے  
تقدیری فیصلوں نے تجھے مجبور اور پابند بنا دیا ہے؟ تجھے قرآن و حدیث کی صورت  
میں ٹھیک ٹھیک کھلی اور روشن ہدایات دی گئی تھیں۔ تجھے بتا دیا گیا تھا کہ تو اپنے  
افعال میں مجبور اور مقید نہیں ہے۔ بلکہ اپنے افعال اور اپنے اعمال پر پورا پورا اختیار  
رکھتا ہے۔ اسی اختیار کی بنیاد پر تجھے تیری نیکی کا صلہ ملے گا اور برائی کی سزا  
دی جائے گی لیکن دنیا اور اس کی اندھی ہوس نے تیری آنکھوں پر پٹی باندھ دی اور  
تو اپنی خواہش کا غلام بن کر رہ گیا۔ تو اس کی ذمہ داری قبول کرنے کے بجائے  
مسئد تقدیر پر ڈالتا رہا۔ قیامت کے روز تیرا کوئی عذر مسموع نہ ہوگا۔ اور تجھے اپنے  
کیسے کی پوری پوری سزا مل کر رہے گی۔



# تصانیف

- |   |  |   |
|---|--|---|
| ۵۱۔ عقیدہ ختم نبوت اور مرزا قلام احمد قادیانی | ۲۶۔ علم — توحیدی یا خلقی                         | ۱۔ تسمیۃ القرآن (تفسیر بسم اللہ الرحمن الرحیم)  |
| ۵۲۔ نظام مصطفیٰ — ایک ایمان افروز اصطلاح      | ۲۷۔ دینی اور لادینی علوم کے اصلاح طلب پہلو       | ۲۔ سورہ فاتحہ اور تعمیر شخصیت                   |
| ۵۳۔ ارکان اسلام مکمل                          | ۲۸۔ جمال دینی زوال اور اس کے تدارک کا سہتی منہاج | ۳۔ اسلامی فلسفہ زندگی                           |
| ۵۴۔ فلسفہ نماز                                | ۲۹۔ عصر حاضر اور فلسفہ جہاد                      | ۴۔ اجزائے ایمان (مکمل)                          |
| ۵۵۔ فلسفہ حج                                  | ۳۰۔ حصول مقصد کی جدوجہد اور نتیجہ خیزی           | ۵۔ ایمان اور اسلام                              |
| ۵۶۔ فلسفہ روزہ                                | ۳۱۔ پیغمبر از حد و جہد اور اس کے نتائج           | ۶۔ مناجات العرفان فی لفظ القرآن                 |
| ۵۷۔ فلسفہ زکوٰۃ                               | ۳۲۔ قرآنی فلسفہ تبلیغ                            | ۷۔ فرقہ پرستی کا خاتمہ کیونکر ممکن ہے؟          |
| ۵۸۔ خطبات لاہور (زیر طبع)                     | ۳۳۔ فطرت کا قرآنی تصور                           | ۸۔ حقیقت توحید و رسالت                          |
| ۵۹۔ حقیقت تصوف                                | ۳۴۔ قرآنی فلسفہ عروج و زوال                      | ۹۔ بلاسود بنکاری (عبوری خاکہ)                   |
| ۶۰۔ گستاخ رسول کی سزا                         | ۳۵۔ پیغمبر انقلاب اور صحیفہ انقلاب               | ۱۰۔ قرآن اور شمال نبوی صلی اللہ علیہ وسلم       |
| ۶۱۔ ایمان بالقدر                              | ۳۶۔ عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم وقت کی اہم ضرورت | ۱۱۔ منافقت اور اس کی علامات                     |
| ۶۲۔ ایمان بالرسالت                            | ۳۷۔ نص او تعمیر نفس                              | ۱۲۔ اسلامی اور مغربی تصور قانون کا تقابلی جائزہ |
| ۶۳۔ ایمان بالکتاب                             | ۳۸۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت مصلح سیادت    | ۱۳۔ سیاسی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل             |
| ۶۴۔ ایمان بالآخرت                             | ۳۹۔ حضرت مولانا شاہ احمد رضا خاں کا عالمی فہم    | ۱۴۔ معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل             |
|   | ۴۰۔ طائفی تیغ کے چار محاذ                        | ۱۵۔ اجتہاد اور اس کا دائرہ کار                  |
|   | ۴۱۔ رب العالمین (الفطرت کے معانی و معانی)        | ۱۶۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور فلسفہ خودی      |
|   | ۴۲۔ لا الہ الا اللہ فی الدین کا قرآنی فلسفہ      | ۱۷۔ شہادت توحید                                 |
|   | ۴۳۔ ہم اپنا اصل وطن مہجول چکے ہیں                | ۱۸۔ معارف اہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم           |
|   | ۴۴۔ خشیت الہی اور اس کے تقاضے                    | ۱۹۔ تاریخ فقہ میں بڑا اور صاحب بڑا کا مقام      |
|   | ۴۵۔ جشن میلاد النبی کی شرعی حیثیت                | ۲۰۔ اقبال اور تصور عشق                          |
|   | ۴۶۔ فساد قلب اور اس کا علاج                      | ۲۱۔ تحقیق مسائل کا شرعی اسلوب                   |
|   | ۴۷۔ غلامی رسول — حقیقی تقویٰ کی اساس             | ۲۲۔ فلسفہ تسمیہ (تفسیر بسم اللہ الرحمن الرحیم)  |
|   | ۴۸۔ عشق رسول — استحکام ایمان کا واحد ذریعہ       | ۲۳۔ حکمت استعاذہ (تفسیر بسم اللہ الرحمن الرحیم) |
|   | ۴۹۔ منہاج الافکار                                | ۲۴۔ معارف اہم اللہ                              |
|   | ۵۰۔ محبت الہی اور اس کے تقاضے                    | ۲۵۔ صفت رحمت کا شان اقیار                       |

- |  |   |
|--|---|
| 1 - Islamic Philosophy of Human Life       | 12 - Islamic Concept of Benevolence                             |
| 2 - Islam in Various Perspectives          | 13 - Quranic Concept of Human Guidance                          |
| 3 - Islam and Christianity                 | 14 - Islamic Concept of Human Nature                            |
| 4 - Islam & Criminality                    | 15 - Islamic Concept of Crime                                   |
| 5 - Legal Character Of Islamic Punishments | 16 - Philosophy of Ijtihad and The Modern World                 |
| 6 - Legal Structure Of Islamic Punishments | 17 - Divine Pleasure (The Ultimate Ideal)                       |
| 7 - Classification Of Islamic Punishments  | 18 - Islam-The State Religion                                   |
| 8 - Islam and Freedom of Human Will        | 19 - Belief in Prophethood (U.P.)                               |
| 9 - Quranic Basis of Constitutional Theory | 20 - CREATION OF MAN A review of Qur'an and Science (U.P.)      |
| 10 - Islamic Philosophy of Punishments     | 21 - CREATION OF UNIVERSE A review of Qur'an and Science (U.P.) |
| 11 - Islamic Concept of Law                |   |

اس کے علاوہ دیگر موضوعات پر پروفیسر صاحب کے ۲۰ مسوات ترتیب و طباعت کے مراحل میں ہیں

ملنے کا پتہ: مرکزی سیکرٹریٹ دارالمنہاج القرآن، ایم ڈال ٹاؤن لاہور۔ فون: ۸۷۴۱۲۲، ضیاء القرآن پبلیکیشنز، گزٹڈ ہاؤس، فون: ۶۳۲۶۲۱  
 ۱۰ ای پلو، بالمقابل ہائی کورٹ شاہراہ قائد اعظم لاہور، فون: ۵۲۰۹۶، دارالمنہاج القرآن الملائک بلازہ 6/B، نزد جہانگیر پارک ایپریس مارکیٹ صہ  
 کراچی فون: ۵۷۱۲۲۳۹، ادارہ منہاج القرآن، بی۔ بی۔ مرکز جی۔ ۹۔ اسلام آباد فون: ۸۱۲۷۹۳-۵، Ext ۲۱۳



تفسیر  
منہاج  
القرآن  
زیر تالیف

پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی چند محکمہ الہامی

خطبات  
سیرت نبوی  
دوسیس  
تصوف زہری  
ترتیب تدریس

# تصانیف

- |    |                                      |    |   |    |  |
|----|--------------------------------------|----|---|----|--|
| ۵۱ | عقیدہ ختم نبوت اور مرزا قادیانی      | ۲۶ | علم - توحیدی یا خلیقی                         | ۱  | تسمیہ القرآن (تفسیر لیسیم اشد الرحمن الرحیم)   |
| ۵۲ | نظام مصطفیٰ - ایک ایمان افروز اصطلاح | ۲۷ | دینی اور لادینی علوم کے اصلاح طلب پہلو        | ۲  | سورہ فاتحہ اور لغویہ شخصیت                     |
| ۵۳ | ارکان اسلام مکمل                     | ۲۸ | ہمارے دینی زوال اور اس کے تدارک کا سہمی منہاج | ۳  | اسلامی فلسفہ زندگی                             |
| ۵۴ | فلسفہ نماز                           | ۲۹ | عصر حاضر اور فلسفہ جہاد                       | ۴  | اجزائے ایمان (مکمل)                            |
| ۵۵ | فلسفہ حج                             | ۳۰ | حصول مقصد کی جدوجہد اور نتیجہ خیزی            | ۵  | ایمان اور اسلام                                |
| ۵۶ | فلسفہ روزہ                           | ۳۱ | پیغمبر ایزد و جہاد اور اس کے نتائج            | ۶  | مناجیح العرفان فی لفظ القرآن                   |
| ۵۷ | فلسفہ زکوٰۃ                          | ۳۲ | قرآنی فلسفہ تبلیغ                             | ۷  | فرق پرستی کا خاتمہ کیونکر ممکن ہے؟             |
| ۵۸ | خطبات لاہور (زیر طبع)                | ۳۳ | فطرت کا قرآنی تصور                            | ۸  | حقیقت توحید و رسالت                            |
| ۵۹ | حقیقت تصوف                           | ۳۴ | قرآنی فلسفہ عروج و زوال                       | ۹  | بلا سوڈ بنکاری (عموری خاکہ)                    |
| ۶۰ | گستاخ رسول کی سزا                    | ۳۵ | پیغمبر انقلاب اور صحیفہ انقلاب                | ۱۰ | قرآن اور شمال بنوی صلی اللہ علیہ وسلم          |
| ۶۱ | ایمان بالقدر                         | ۳۶ | عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم وقت کی ہم ضرورت   | ۱۱ | مناقت اور اس کی علامات                         |
| ۶۲ | ایمان بالرسالت                       | ۳۷ | نص اور تعبیر نص                               | ۱۲ | اسلامی اور مغربی تصور قانون کا تقابلی جائزہ    |
| ۶۳ | ایمان بالکتاب                        | ۳۸ | حضور صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت مصلح سیاست     | ۱۳ | سیاسی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل                |
| ۶۴ | ایمان بالآخرت                        | ۳۹ | حضرت مولانا شاہ احمد رضا خاں کا علمی ظہور     | ۱۴ | معاشری مسئلہ اور اس کا اسلامی حل               |
|    |                                      | ۴۰ | طغویٰ تیغ کے چار محاذ                         | ۱۵ | اجتہاد اور اس کا دائرہ کار                     |
|    |                                      | ۴۱ | رب العالمین (الفطرت کے معانی و معانی)         | ۱۶ | شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور فلسفہ خودی         |
|    |                                      | ۴۲ | لا الہ الا اللہ فی الدین کا قرآنی فلسفہ       | ۱۷ | شہادت توحید                                    |
|    |                                      | ۴۳ | ہم اپنا اصل وطن مہول چکے ہیں                  | ۱۸ | معارف اہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم              |
|    |                                      | ۴۴ | نخستین نبی اور اس کے تقاضے                    | ۱۹ | تاریخ فقہ میں ہدایہ اور صاحب ہدایہ کا مقام     |
|    |                                      | ۴۵ | جشن میلاد النبی کی شرعی حیثیت                 | ۲۰ | اقبال اور تصور عشق                             |
|    |                                      | ۴۶ | فساد قلب اور اس کا علاج                       | ۲۱ | تحقیق مسائل کا شرعی اسلوب                      |
|    |                                      | ۴۷ | غلامی رسول - حقیقی تقویٰ کی اساس              | ۲۲ | فلسفہ تسمیہ (تفسیر لیسیم اشد الرحمن الرحیم)    |
|    |                                      | ۴۸ | عشق رسول - حکم ایمان کا واحد ذریعہ            | ۲۳ | حکمت استعاذہ (تفسیر ابو ذر اشرفی رضی اللہ عنہ) |
|    |                                      | ۴۹ | منہاج الافکار                                 | ۲۴ | معارف اہم اللہ                                 |
|    |                                      | ۵۰ | محبت الہی اور اس کے تقاضے                     | ۲۵ | صفت رحمت کا شان اقیانوس                        |

- |   |  |
|---|--|
| 1- Islamic Philosophy of Human Life       | 12- Islamic Concept of Benevolence                             |
| 2- Islam in Various Perspectives          | 13- Quranic Concept of Human Guidance                          |
| 3- Islam and Christianity                 | 14- Islamic Concept of Human Nature                            |
| 4- Islam & Criminality                    | 15- Islamic Concept of Crime                                   |
| 5- Legal Character Of Islamic Punishments | 16- Philosophy of Ijtihad and The Modern World                 |
| 6- Legal Structure Of Islamic Punishments | 17- Divine Pleasure (The Ultimate Ideal)                       |
| 7- Classification Of Islamic Punishments  | 18- Islam-The State Religion                                   |
| 8- Islam and Freedom of Human Will        | 19- Belief in Prophethood (U.P.)                               |
| 9- Quranic Basis of Constitutional Theory | 20- CREATION OF MAN A review of Qur'an and Science (U.P.)      |
| 10- Islamic Philosophy of Punishments     | 21- CREATION OF UNIVERSE A review of Qur'an and Science (U.P.) |
| 11- Islamic Concept of Law                |  |

اس کے علاوہ دیگر موضوعات پر پروفیسر صاحب کے ۲۰ مسوات ترتیب و طباعت کے مراحل میں ہیں

ملنے کا پتہ: مرکزی سیکرٹریٹ ادارہ منہاج القرآن، ایم ڈال ٹاؤن لاہور، فون: ۰۸۴۷۱۲۲، فیکس: ۰۸۴۷۱۲۳، پتہ: ۲۳/۱، فون: ۲۳۲۲۱

۱۰ ای پلو برائے مقابل ہائی کورٹ شاہراہ قائد اعظم لاہور، فون: ۰۵۲۰۹۶، ادارہ منہاج القرآن الملائک بلازہ ۵/۶، نزد جہانگیر پارک ایپریس مارکیٹ ص ۵

کراچی فون: ۰۷۱۴۲۳۹، ادارہ منہاج القرآن، بی۔ بی۔ مرکز جی۔ ۹، اسلام آباد فون: ۵-۸۱۲۷۹۲، EXT ۲۱۲